U33177 Date - 22.12.0?

Title - ZUBAN KA MASLA.

Creator - Pandit Jawahar Lal Nehru; Murat Mohd. Mazharul Haq.

Publisher - Ilmi Electric ~~Press~~ Machine Pre (Banaras).

Date - 1947.

Pages - 84

Subjects - Urdu Zaban - Masail; Lisaniyaat; Hindustani Zuban

زبان کا مسئلہ

از

پنڈت جواہر لال نہرو۔ وزیر اعظم ہند

مرتبہ

محمد مظہر الحق

بغرض تبصرہ

فہرست

(باہتمام مرزا منشی علمی الیکٹرک مشین پریس مقیم گنج بنارس میں چھپی)

پیش لفظ

اردو ہندوستان کی تمام زبانوں میں آخری زبان ہے اس لئے اس کی عمر دوسری زبانوں سے نسبتاً بہت کم ہے لیکن اس تھوڑے سے عرصہ میں اردو کا سرمایہ ادب الفاظ و معانی کے اعتبار سے کافی ترقی کر چکا ہے۔ نثر اور نظم کی مختلف اصناف میں مسلم الثبوت مصنفین و شعراء کے شاہکار موجود ہیں جن سے فصاحت و بلاغت اور سلاست و لطافت کا بلند معیار ظاہر ہوتا ہے۔ اور جن کے معنی خیز مضامین زبان کی صلاحیت و اہلیت کو روشن کرتے ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا مضمون دیکھئے۔ اس میں پنڈت جی نے اس چیز کو نہایت شدت کے ساتھ قائم رکھا ہے۔ دوسرے یہ مضمون خیالات کے لحاظ سے بھی قابلِ قدر ہے۔

اردو کا مسئلہ:-

اس دور میں جبکہ اردو کا جگر مجروح کیا جا رہا ہے۔ اس کی بنیادیں تعصب کی کلہاڑی سے مسمار کی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کا یہ مضمون کافی اہمیت رکھتا ہے۔ کاش اربابِ حل و عقد اس کی طرف توجہ دیتے۔

اردو زبان اور اردو رسل و صحائف:-

آج جبکہ اردو اخبار اور رسالوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے اس کے متعلق نکہت آرا بیگم نے جو خیال ظاہر کیا ہے اس سے کسی طرح چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ آپ کا یہ مضمون قابلِ قدر ہے۔

سخن ہائے گفتنی :-

ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات میں اس مضمون کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ متحدہ کلچر کی طرف ایک واضح اشارہ ہے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان صدیوں اس طرح مل جل کر رہے ہیں کہ دونوں اپنی خاصیت کو بھول بیٹھے۔ اور دونوں کے تمدن کی امتزاج نے ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالی۔

اردو- ہندی- ہندوستانی :-

اس مضمون کی حقیقت بیانی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جو اعتراضات اس میں ناگری رسم الخط پر کئے گئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب اس کا جواب دینا چاہیں تو بڑے شوق سے ان کا یہ احسان، ناگری رسم الخط کبھی نہ بھولیگا۔

ہماری زبان :-

علامہ محمد فاروق صاحب کا یہ تاریخی مضمون تاریخ کا زندہ شاہکار ہے۔ اگر آپ نے اسے تعصب کی عینک اتار کر پڑھا تو ایمانداری سے کہنا پڑے گا کہ آج زبان اُردو کو نہیں بلکہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کو نقصان پہونچایا جا رہا ہے۔

اس زبان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اندر خیالات و افکار کے اظہار کی ایک غیر معمولی قوت موجود ہے۔ جیسے ہمارے ملک کے رہنے والے اپنی علمی و ادبی ضروریات کے لئے بلاتکلف استعمال کرتے ہیں۔ اس قوت کا اصلی سرچشمہ زبان کی بنیادی خصوصیات ہیں۔ کیونکہ یہ زبان عربی، فارسی، ترکی، بھاشا، اور انگریزی کے اختلاط کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اندر ان تمام زبانوں کی ظاہری اور

معنوی تباحتیں جمع ہیں اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ان کو زیادہ وسیع پیمانہ پر سمویا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج پنڈت سندر لال، ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور پنڈت جواہر لال جیسے اہل نظر سکون و سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ بہت جلد یہ گتھی سلجھ جائے گی۔

مظہر الحق

۶

زبان کا مسئلہ

جواہر لال نہرو

میں یہ مضمون وزیر اعظم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مصنف کی حیثیت سے اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں جسے زبان کے مسئلے سے بے حد دلچسپی ہے۔ میری یہ دلچسپی مسئلے کے سیاسی اور بدقسمتی سے فرقہ وارانہ، پہلوؤں کی وجہ سے ہے لیکن اس مسئلے کے وسیع تر تمدنی پہلو مذکورہ پہلوؤں سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ میں کسی زبان کا ماہر تو نہیں ہوں لیکن کسی زبان میں جو حسن ہوتا ہے۔ اس کی روزمرہ اور محاوروں میں جو موسیقی ہوتی۔ اور الفاظ میں جو سحر اور طاقت ہوتی ہے اس کا میں دلدادہ رہا ہوں میرے نزدیک کسی قوم کے کردار کا اندازہ جتنا اس کی زبان سے ہوتا ہے کسی دوسری چیز سے نہیں ہوتا۔ اگر زبان پرزور اور جاندار ہے تو یہی خوبیاں اس کے بولنے والوں میں بھی پائی جائیں گی۔ اور اگر زبان سطحی، بناوٹی اور الجھی ہوئی ہے تو یہی عیوب بولنے والوں میں نظر آئیں گے۔ بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کہ قوم کے عیوب و محاسن زبان میں جھلکتے ہیں۔ کیونکہ قوم ہی تو ہے جو زبان بناتی ہے۔ تاہم اس میں بھی کچھ حقیقت ضرور ہے کہ زبان قوم کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہے۔ زبان باضابطہ ہوگی تو لوگوں کی فکر میں باقاعدگی پیدا کرے گی۔ الفاظ کے معانی میں سستی اور بےضابطگی نہیں ہے تو خیال

میں بے ربطی اور الجھاؤ پیدا ہوگا جس کا اثر افعال پر پڑے گا۔ اور وہ بھی بے تکے ہوں گے۔

جو زبان ایک تنگ غلاف میں اس طرح منڈھی ہوئی ہے کہ اس کو نئی تبدیلیوں کی ہوا تک نہ لگنے پاتی ہو، خواہ وہ کتنی ہی لطیف اور چست ہو، بدلتے ہوئے ماحول اور عوام الناس سے دور ہو جائے گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا زور جاتا رہے گا۔ اور اس میں ایک قسم کی بناوٹ آجائے گی۔ یہ صورت کسی زمانے میں بھی مفید نہیں ہوسکتی لیکن موجودہ ترقی پذیر زمانہ میں تو جبکہ ہمارے گرد و پیش کی ہر چیز بدل رہی ہے۔ یہ تنگ غلاف زبان کی جان ہی لے لے گا۔ عہد گزشتہ کی درباری زبانوں میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن اس جمہوری زمانے کے لئے جس میں تعلیم عام ہمارے پیش نظر ہے وہ بالکل ناموزوں ہیں۔ اس لئے زبان کے اندر دو خصوصیتیں ضرور ہونی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اس کی بنیاد اچھی قدیم اصل پر ہو۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس میں لچک ہو کہ وہ بدلتے ہوئے حالات اور ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ اور بجائے ایک مخصوص طبقے کی زبان بن کر رہ جانے کے عوام کی زبان بن سکے۔ اس سائنسی صنعتی دور میں بین الاقوامی میل جول کے دور میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ سائنس اور صنعت کی اصطلاحیں کم و بیش یکساں ہوں اس لئے ایک زندہ زبان کی یہ بھی خصوصیت ہونا چاہیئے کہ دوسری زبانوں کے اصطلاحی الفاظ کو اپنے حالات کے لحاظ سے ضروری تراش خراش کے بعد اپنے دامن میں فراخ دلی کے ساتھ جگہ دے سکے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کلاسکی زبانیں انسانی سوسائٹی کی ترقی

میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ عوامی زبان کی راہ میں رکاوٹ بھی رہی ہیں جب تک پڑھے لکھے قابل لوگ کلاسکی زبان میں لکھتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے۔ اس وقت تک عوامی زبان آگے نہ بڑھ سکے گی۔ ہم دیکھتے ہیں سولھویں صدی تک یورپ میں لاطینی زبان یورپی زبانوں کی ترقی میں حائل رہی۔ بالکل اسی طرح ہندوستان میں سنسکرت کا اتنا اثر رہا کہ پراکرت جو بعد کو صوبائی زبانوں میں تبدیل ہو گئیں، پنپ نہ سکیں۔ سنسکرت کے بعد اس کی جگہ فارسی نے لے لی اور پڑھے لکھے لوگوں نے اس کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا، اور عوامی زبانیں نیچی کی زندگی بسر کرتی رہیں اور پروان نہ چڑھ سکیں۔

یہ صحیح ہے کہ ہمیں اپنی صوبائی زبانوں کو ترقی دینا ہے لیکن اس کے ساتھ پورے ملک کے لئے ایک مشترکہ زبان کی بھی ضرورت ہے جو ظاہر ہے کہ انگریزی یا دوسری بیرونی زبان نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ میں سمجھتا ہوں، کہ انگریزی اپنی وسعت نیز ہندوستان میں اپنی مقبولیت کی بنا پر ہماری آئندہ سرگرمیوں میں کافی اہمیت رکھے گی۔ لیکن اس کے باوجود وہ ملک کی زبان نہیں قرار دی جا سکتی۔ ملک کی زبان تو ہندی یا ہندوستانی، یا اسے جو بھی کہا جائے ہو سکتی ہے۔

ہمیں اس اہم مسئلے پر غور کرتے وقت چند بنیادی باتوں کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ہم جب اس مسئلے پر غور کریں تو اس کے بارے میں ہمیں کوئی فیصلہ عجلت کے ساتھ سیاسی اور وقتی اثرات اور جذبات کے ماتحت نہ کرنا چاہیے۔ ورنہ وہ بہت مضر اور خطرناک ثابت ہوگا۔ چونکہ ہمار

اس فیصلے پر آئندہ عمارت تعمیر کی جائے گی۔ اس لئے اگر بنیاد رکھنے میں کوئی غلطی ہوئی تو اس کا اثر صرف زبان پر ہی نہ پڑے گا بلکہ ترقی و نشو و نما بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گا۔ اس لئے اس معاملے میں عجلت سے کام لینا سست رفتاری کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہوگا۔ زبان ایک لطیف اور نازک آلہ ہے جو نفیس اور اعلیٰ دماغوں میں ڈھلنے کے بعد عوام کی زبان پر چڑھ کر زور اور طاقت حاصل کرتا ہے زبان ایک پھول کی مانند ہے جو مصنوعی آب و ہوا کے دباؤ سے مرجھا جاتا ہے یا پھر اس کی شاخیں دباؤ کے باعث ٹیڑھی ہو کر غلط رخ اختیار کر لیتی ہیں

اس میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں کہ ہم اپنی زبان کو ہندی کے نام سے یاد کریں۔ یا ہندوستانی کے نام سے۔ بس اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ دونوں الفاظ اپنی ایک تاریخ رکھتے ہیں اور ایک مخصوص اور معین چیز کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی بناء پر اس کے معنی محدود ہو جاتے ہیں۔ ہم کو اس معاملے میں زیادہ توجہ نام کے بجائے اس کے اندرونی ڈھانچے پر دینی چاہیئے۔ کہ وہ دنیا کو کس نظریئے سے دیکھتی ہے۔ اس کے دروازے بند۔ اس کا دامن تنگ، اس کا طرز خود کفالتی اور اس کی طبیعت علیحدگی پسند ہے۔ یا اس کے برعکس ہے۔ ہمیں آزادانہ طور پر ایسی زبان بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے جس کا دامن وسیع ہو تاکہ وہ زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہو سکے۔ انگریزی زبان بحیثیت زبان کے صرف اس لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں وسعت لچک اور بڑھنے کی اہلیت پائی جاتی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ہماری زبان انہی خصوصیات کی حامل ہو تاکہ دنیا کے مسائل سے دوچار ہو سکے

مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ زبان کے مسئلے پر ہمارے یہاں جب کوئی بحث ہوتی ہے۔ تو اس میں نہ تو عالمانہ شان ہوتی ہے نہ تمدنی احساس، اور نہ دور اندیشی کی جھلک، عام طور پر زبان کو اخباری زبان کی حیثیت سے غلط قومی نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ تنگ اور محدود بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور ہر وہ اقدام جو اسے وسیع بنانے کے لئے کیا جاتا ہے اسے قوم پروری کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ زبان کی خوبی اور خوبصورتی خیال کی جاتی ہے۔ کہ اس میں بلا وجہ بناوٹ سنگار سے کام لیا جائے اور پیچیدہ اور لمبے جملے استعمال کئے جائیں۔ اس میں نہ تو زور ہوتا ہے اور نہ شکوہ۔ صرف اغلاق اور بناوٹ پائی جاتی ہے۔ جس طرح شاعری صرف وزن اور قافیہ تک محدود نہیں اسی طرح زبان پیچیدہ جملوں اور سخت الفاظ کے استعمال سے نہیں بن سکتی۔ اس طرف انگریزی کے چالو الفاظ کا خواہ مخواہ ترجمہ کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اسے سوائے خبط اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اگر یہ رجحان یونہی باقی رہا تو اظہار خیال کے ایک عمدہ ذریعے کا خون یقینی ہے۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ ہندوستان کا سب سے زیادہ قیمتی خزانہ اور سب سے بیش بہا ترکہ کیا ہے۔ تو میں بلا جھجک کہوں گا سنسکرت۔ سنسکرت اور اس کا ادب ہمارے لئے صرف ایک پرانا بہترین خزانہ ہی نہیں بلکہ وہ زندہ روایات ہیں جو ہماری زندگی کو ہمیشہ متاثر کرتی رہیں گی۔ ہمیں اس کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ اس کے ادبی خزانے کو دنیا کے سامنے لانا چاہیئے۔ جو نظروں سے چھپا ہوا پڑا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ

لوگ اس معاملے میں زبان سے تو دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور اس کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال بھی کرتے ہیں۔ لیکن اس کی کوئی واقعی خدمت نہیں کرتے۔ سنسکرت ہو یا موجودہ ہندوستانی زبانیں۔ ان میں تعمیری کام کرنے والے بہت کم نظر آتے ہیں۔ اور "نہ آگے بڑھو اور نہ بڑھنے دو" کی پالیسی پر زیادہ عمل کرتے ہیں۔ نہ تو خود کوئی کام کرتے ہیں اور نہ کرنے دیتے ہیں۔ کوئی زبان قانون اور قرار دادوں کے بل بوتے نہیں بڑھتی۔ بلکہ اپنی اندرونی اہلیت اور خصوصیات کی بنا پر ترقی کرتی ہے۔ اس لئے کسی زبان کی اصلی خدمت اس کو قابل استعمال اچھا اور ستھرا بنانے کی کوشش ہے۔

سنسکرت کو پڑھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ زندہ زبان کی حیثیت سے رائج کی جاسکتی ہے۔ وہ بدستور ایک سرچشمہ کی حیثیت سے ہندوستان کی بہت سی زبانوں کو سیراب کرتی رہے گی۔ لیکن اُسے زبردستی رائج کرنا نہ تو ضروری ہے اور نہ مناسب بلکہ اس سے خراب نتائج برآمد ہونے کا اندیشہ ہے۔

فارسی زبان کا اثر :-

پچھلی چند صدیوں میں ہماری کچھ صوبائی زبانوں خصوصاً ہندوستانی زبان کے بنانے میں فارسی نے بہت اہم حصہ لیا ہے۔ اور ایک حد تک ہمارے طرز فکر میں بھی اثر انداز ہوئی ہے۔ جس سے ہمیں فائدہ پہنچا ہے۔ اور ہمارا لسانی خزانہ زیادہ مالدار ہو گیا ہے۔ یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ فارسی سے زیادہ کوئی زبان سنسکرت سے قریب نہیں ہے۔ ویدانی سنسکرت اور قدیم پہلوی (فارسی) بہ نسبت ویدانی سنسکرت اور

کلاسکی سنسکرت کے زیادہ قریب ہیں اس لیئے دونوں کی ملاوٹ آسان
ہے اور کسی طرح ہمارے لسانی اور نسلی جوہر کے خلاف نہیں ہے بہرحال
چند صدیوں کی تاریخ اور عوام کی زندگی نے ہم کو موجودہ حالات تک پہنچایا
اور تاریخ کے اس کام کو مٹانے کی کوشش کرنا لغو اور ناسمجھی کی بات ہے۔
ثقافتی نقطہ نظر سے اس کو ختم کرکے پھر پیچھے لوٹنے کے معنی یہ ہوں گے
کہ ہم اپنے آپ کو اس ثقافتی دولت سے محروم کر دینگے۔ جو ہماری ملکیت
تھی۔ اور اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم خود ہی اپنے کو نادار بنا رہے ہیں۔
ہمیں ان تمام اثرات کو قبول کرنا چاہیئے۔ جو ہمارے ثقافتی سرمایے میں
اضافہ کر سکیں۔ اس لیئے ہم نے جو کچھ ابھی تک اپنی زبان میں ضم کر لیا
ہے۔ اس کو خارج کرنے کی کوشش ہر پہلو سے غلط ہوگی۔ اگر ہم ان باتوں
کو پیش نظر رکھیں تو اس سے نتیجہ نکلے گا کہ پورے ہندوستان کی زبان
جو ہم بنانا چاہتے ہیں۔ اس میں کافی وسعت اور گنجائش ہونا چاہیئے جو ان نے
تمام تمدنی خصوصیات کو قبول کرکے برقرار رکھ سکے۔ جو اس نے پرانے زمانے
میں حاصل کیئے ہیں۔ اس زبان کو لازمی طور پر پڑھے لکھے آدمیوں کے
چھوٹے سے حلقے کی زبان نہیں بلکہ عوام کی زبان ہونا چاہیئے۔ اس کو با وقار
اور زور دار ہونا چاہیئے۔ اور یہ کوشش کرنا چاہیئے کہ اس میں تصنع اور
ادبی پن نہ ہو۔ لازمی طور پر اس کی بنیاد اور اجزا ضروری ہیں کچھ سنسکرت
کے الفاظ ہوں گے۔ لیکن اس میں دوسری زبانوں خصوصاً فارسی، انگریزی
اور دوسری غیر ملکی زبانوں کے بھی الفاظ اور جملے اور خیالات ہوں گے۔
جہاں تک فنی اصطلاحوں کا سوال ہے سب سے پہلے ہمیں اس بات کا
خیال رکھنا چاہیئے۔ کہ وہ عام فہم ہوں اور مروجہ زبان سے قریب ہوں فنی

الفاظ ہیں جہاں تک ممکن ہو ہمیں اس عالمی زبان کے راستے سے الگ نہ ہونا چاہیئے۔ جو آجکل ترقی پا رہی ہے۔

یہ بہتر ہوگا کہ پہلے بنیادی الفاظ جمع کر لئے جائیں۔ (مان لیجیئے کہ تقریباً تین ہزار الفاظ ایسے ہیں) جو عام فہم الفاظ ہوں اور جن کو عام طور پر لوگ استعمال کرتے ہوں ان میں ایک ہی مطلب کے لیئے دو الفاظ ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ عام استعمال میں آتے ہوں۔ یہ ہماری زبان کا بنیادی ذخیرہ ہونا چاہیئے جس کا علم ہر اس شخص کو ہونا چاہیئے، جو ہندوستان کی زبان جاننا چاہتا ہو۔

اس کے بعد مندرجہ بالا معیار کے مطابق فنی الفاظ کی بھی ایک فہرست تیار ہونی چاہیئے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کثیر تعداد میں نئی فنی اصطلاحیں ایسی ہیں جن کے بنانے میں غیر معمولی تصنع سے کام لیا گیا ہے۔ اور محاورے کے لحاظ سے ان کا مطلب بالکل خبط ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے پس منظر میں تاریخ کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ ایسے الفاظ میرے لیئے بہت ڈراؤنے ہیں۔

اگر یہ دو فہرستیں تیار کر لی جائیں تو باقی کو زبان کے فطری ارتقاء پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کے خالص ادبی ہندی یا خالص ادبی اردو یا ان دونوں کی درمیانی زبان لکھنے پر پابندی نہ ہونا چاہیئے۔ تعلیم کی توسیع سے پڑھنے والے پڑھیں گے جن کا زبردست اثر لازمی طور پر مصنفین اور مقررین پر پڑے گا۔ اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رفتہ رفتہ ایک نفیس اور زوردار زبان پیدا ہوگی اور یہ کسی دباؤ کے بغیر وسعت پائے گی۔

یہ بات قابلِ حیرت ہے کہ ہم زبان کی بابت تو اس قدر جھگڑتے ہیں لیکن ہمارے پاس کوئی مکمل لغت نہیں ہے۔ دنیا کی کسی بڑی زبان کو دیکھئے اس میں کتنی لغت اور انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ ہماری زبان کا معیار عدالتی زبان یا اسکول کی کتابوں کی زبان رہ گیا ہے ہماری لغت بھی اسکول کے لڑکوں کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہیئے۔ وہ مکمل اور عالمانہ لغات بنانے کے لئے ہونا چاہیئے۔ جو سنسکرت کے لئے بھی ہوں اور ہماری موجودہ زبانوں کے لئے بھی۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کسی زبان کا نام اہم نہیں ہوتا بلکہ زبان کا سرمایہ اس کو اہم بناتا ہے۔ جو کچھ کہ میں نے کہا ہے اور جو الفاظ آجکل استعمال ہوتے ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے میری نظر انتخاب ہندوستانی پر پڑتی ہے۔

رسم خط:۔

جہاں تک رسم خط کا تعلق ہے یہ بالکل واضح ہے کہ ناگری رسم خط حاوی ہوگا۔ لیکن چونکہ میں تمدنی اور سیاسی نقطہ ہائے نظر سے تنگ نظری پالیسی کو غلط سمجھتا ہوں۔ اس لئے میری رائے ہے کہ اردو رسم خط کی جہاں ضرورت ہو اسے تسلیم کیا جائے۔ اور اسے سکھایا بھی جائے۔ ہم عوام سے دونوں رسم خط سیکھنے کا مطالبہ نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ یہ ان پر ایک بہت بڑا بوجھ ہوگا۔ لیکن ہمیں اردو رسم خط کو تسلیم کرنا چاہیئے خصوصاً جہاں تک دستاویزات اور دوسرے کاغذات کے پیش کرنے کا تعلق ہے اس کے علاوہ ہمیں اردو رسم خط کے سکھانے کا

بھی ان اسکولوں میں انتظام کرنا چاہیئے۔ جہاں کافی طلبہ اس کے سیکھنے کے خواہش مند ہوں۔

یہ طریقہ کار زبان کے بارے میں ہماری اس پالیسی کے عین مطابق ہے جس کا ہم کانگریس اور دستور ساز اسمبلی کے ذریعے اعلان کر چکے ہیں۔ یہ پالیسی یہ ہے کہ ہر بچے کو ابتدائی تعلیم اس کی مادری زبان میں دی جائے بشرطیکہ ایک مخصوص علاقے کے بچے اس کے خواہشمند ہوں اور اس پر آسانی سے عمل ہو سکے۔ اس طرح بمبئی یا کلکتہ یا دہلی میں اگر تامل بولنے والے بچوں کی کافی تعداد ہے تو انھیں اس کا موقع ملنا چاہیئے کہ وہ تامل میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کر سکیں۔ اسی طرح اگر ہندوستان کے کسی حصہ میں ایسے بچوں کی کافی تعداد ہے جن کی مادری زبان اردو ہے تو انھیں صوبائی زبان کے ساتھ اردو رسم خط بھی سکھانا چاہیئے۔ یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بہت ضروری ہے۔ کہ اس پر جلد سے جلد عمل شروع کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں بہت سی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں خصوصًا ان علاقوں میں جہاں دو صوبے ایک دوسرے سے ملتے ہیں دونوں صوبوں کی سرحد کے علاقہ میں دو زبانیں رائج ہیں۔ اور دوسری جگہوں کے مقابلہ میں اس جگہ اس بات کی خصوصیت کے ساتھ ضرورت ہے کہ مادری زبان میں ابتدائی تعلیم دی جائے۔

میرا خیال ہے کہ ہم رومن خط کو وسیع پیمانے پر رائج نہیں کر سکتے ہیں لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ رومن رسم خط فوج میں کامیابی کے ساتھ استعمال ہوتا رہا ہے۔ تجربے نے یہ بھی ثابت کیا ہے اس کا سیکھنا بہت آسان ہے اس کے ساتھ

ہی کسی حد تک یہ فوج میں اتحاد قائم کرنے کا سبب بنا ہے۔ اس لئے رومن رسم خط کے استعمال کرنے کے امکانات پر غور کرنا چاہیئے اور اسے جہاں ضرورت ہو استعمال کرنا چاہیئے۔

مصنفوں سے :-

اس مضمون کے شروع میں میں نے لکھا تھا کہ میں یہ مضمون ایک مصنف کی حیثیت سے لکھ رہا ہوں۔ کیا میں یہاں مصنفوں خصوصاً ہندی اور اردو کے مصنفوں کو کچھ مشورہ دے سکتا ہوں؟ مجھے یہ دیکھکر بہت دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے بہترین مصنفوں کو ناشروں کے ہاتھوں کتنی تکلیفیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ اور اکثر صورتوں میں وہ کس طرح ان کے اغراض کا شکار رہ گئے ہیں۔ ایک طرف جرنلسٹ توکامیاب زندگی بسر کرتے ہیں لیکن دوسری طرف اہلیت رکھنے والے حقیقی مصنفوں کو کامیابی کے بہت کم مواقع میسّر ہیں۔ مجھے ایسے واقعات کا علم ہے جہاں ناشروں نے ہندی کتابوں کے کاپی رائٹ چند ٹکوں میں خرید لئے ہیں۔ کیونکہ غریب مصنف فاقوں مر رہا تھا اور اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ یہ ناشر ان کتابوں کے ذریعہ خوب روپیہ کماتے ہیں اور مصنف فاقوں مرتا ہے۔ میرے خیال میں یہ طریقہ بہت شرمناک اور ہماری کھلی ہوئی توہین ہے۔ میں ناشروں سے اپیل کروں گا کہ وہ مصنفوں سے ایسا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں ناشر بھی اسی صورت میں سرسبز ہو سکتے ہیں جبکہ مصنف بھی سرسبز ہو۔ اس کے علاوہ ناشر کے نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک احمقانہ پالیسی ہے کہ وہ مصنف کو فاقوں مرنے دے اور اس طرح اسے اچھا کام کرنے

سے روکے۔ لیکن قومی نقطہ نظر سے یہ مسئلہ اور بھی اہمیت رکھتا ہے یہ کام قوم کا ہے کہ وہ اس کا خیال رکھے کہ ہمارے اہلیت رکھنے والے مصنفوں کو اچھا کام کرنے کے مواقع میسر ہیں ؛

اردو کا مسئلہ

(عبادت بریلوی)

ماہرین لسانیات کا یہ خیال کہ زبانوں کا ارتقا فطری ہوتا ہے اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن کسی قوم کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی اس وقت ہوتی ہے جب اس کے افراد اس خیال سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ سوچکر زبان کے متعلق اپنے فرائض کو فراموش کر دیتے ہیں کہ جب زبان کا ارتقا فطری ہوتا ہے تو پھر انھیں اس کے لئے کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ زبان فطری طور پر ترقی کرتی ہے۔ اور مصنوعی طاقتیں اس کے راستے میں حائل نہیں ہوسکتیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زبان کے معاملہ میں ہر قوم کے افراد ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جائیں۔ اور اس خوش خیالی اور خوش اندیشی کی سہانی دنیا میں بسیرا لیتے رہیں کہ انھیں زبان کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ماہرین لسانیات کے قول کے مطابق وہ خود بڑھیگی یہ خیال بڑے درجے کی انحطاط پسندی اور زوال آمادگی پر مبنی ہے اور جس قدر نقصان آج ہماری زبان کو پہونچایا جارہا ہے۔ اور جس کے

نتیجے میں آج ہماری تہذیب جس بری طرح زخمی ہو رہی ہے۔ اس کا صحیح احساس اگر سب کو ہو جائے اور آج سے سو یا پچاس سال بعد کی صورت حال کا نقشہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں تو میں سچ کہتا ہوں زندگیاں تلخ ہو جائیں۔ لوگوں میں دیوانگی کے آثار نمایاں ہونے لگیں اور بہت سے تو اس بھیانک صورت حال کی تاب نہ لا کر خود کشی کر لیں جو مستقبل نے اپنے دامن میں چھپا رکھی ہے اور جس سے دو چار ہونا اگر یہی لیل و نہار ہے تو ہم سب کے لئے لازمی اور یقینی ہے۔

اردو، ہماری زبان، اس وقت بڑے ہی نازک دور سے گزر رہی ہے، آج اس پر ایسا وقت پڑا ہے جس کی مثال دنیا جہان کی زبانوں کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ ایک تو خواہ مخواہ کی مخالفت ہے جو اس کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتی۔ اور اس کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے درپے ہے۔ اور دوسرے خود اپنوں کی بیگانگی، بے نیازی اور نادان دوستی ہے جس نے اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری زبان کے قدم ڈگمگاتے جا رہے ہیں اور اس کا جینا دوبھر ہو گیا ہے۔

ہمیں اور ہماری زبان کو مخالفین سے کوئی شکایت نہیں اور نہ شکایت ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اب یہ حقیقت نور و زر روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ یہ ایک بڑی تحریک کا حصہ ہے۔ قدامت و رجعت کے سائے میں پھیلتے اور بڑھتے ہوئے احیائی رجحانات اس کا سرچشمہ ہیں اور آج ہی نہیں برسوں سے یہ کوشش جاری ہے۔ ایک منظم سازش کے نتیجے میں ان کی نشو و نما ہوئی ہے۔ مذہب اور دھرم کے

نام پر افراد کے دلوں میں اس کی مخالفت کی آگ کو بھڑکا دیا گیا ہے۔ اور بھولے بھالے انسان، جو کچھ نہیں جانتے اس دھارے پر ایک انجان منزل کی طرف بہہ نکلے ہیں۔ آج سے پہلے ان فتنوں کا ایسا زیادہ بس نہیں چلتا تھا لیکن اب انھیں من مانی کرنے کا موقع مل گیا ہے اب تو وہ یہ بات تک کہنے کی جرأت کرنے لگے ہیں کہ ہماری زبان ہمیشہ ہمیشہ افتراق و اختلاف کے شعلوں کو ہوا دیتی رہی ہے۔ حالانکہ ہماری زبان میں جس خلوص، محبت اور میل جول کے چشمے پھوٹے ہیں۔ اور جن کی حیثیت آج بھی نہ خشک ہونے والے دریاؤں کی سی ہو گئی ہے۔ اس سے کوئی ایسا شخص چشم پوشی نہیں کر سکتا جس نے زبان اور ادب کی طرف کبھی کبھار ایک نگاہِ نیم باز ڈالنے کی بھی زحمت گوارا کر لی ہے۔ اس کی تو بنیاد ہی خلوص، محبت اور میل جول پر قائم ہوئی ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مخالفین نے احیائی رجحانات کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لئے اس کو سیاست سے الجھا دیا ہے۔ اور جس مسئلے کو علمی اور لسانی ماہرین کے ہاتھوں طے ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ایسے سیاسی رہنماؤں کے ہاتھوں طے ہو رہا ہے جنھیں لسانیات کی ابجد سے بھی تو واقفیت نہیں۔ بہر حال یہ سلسلہ جاری ہے اور کون جانے کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ بڑی مشکل یہ آ پڑی ہے کہ اب ان فتنوں کو من مانی کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ وطن عزیز کی تقسیم کے نتیجے میں نفرت کے جو طوفان اُمڈے۔ ان سب کے رُخ انھوں نے اس طرف موڑ دیئے ہیں اور اس میں اس قدر شدت پیدا ہو گئی ہے کہ معقولیت اور ترقی پسندی کی آوازیں صدا بصحرا ثابت ہو رہی ہیں۔ یہانتک کہ شہید اعظم مہاتما گاندھی تک کی کوئی نہیں سنتا۔ زبان کے

متعلق جس آئیڈیل کا وہ مرتے دم تک علم بلند کرتے رہے۔ آج اس کی
قدر کرنے کے بجائے بعض لوگ کھلے خزانے ان کا مضحکہ اڑاتے پھرتے
ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ان سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ ان کو
بے مہار چھوڑ دیا گیا ہے۔ حالانکہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ اس جماعت
کے اصولوں کے صریحاً خلاف ہے جس میں یہ لوگ شامل ہیں۔ میں تو یہ
کہتا ہوں، اس جماعت کو کیا ہو گیا؟ — ان لوگوں کو کیا ہو گیا جن
کا شمار اس جماعت کے ارباب حل و عقد میں ہوتا ہے۔ وہ لوگ کہاں
سو گئے جو شہید مہاتما گاندھی کی ہر بات پر عمل کرنا اپنی زندگی کا نصب
العین سمجھتے تھے۔ اور جن کی شہادت کے وقت انہوں نے پھر متعدد
بار یہ عہد کیا تھا کہ وہ زندگی بھر مہاتما جی کے زریں اصولوں کو شمع راہ
بنا کر آگے بڑھیں گے۔ آئندہ وطن عزیز کی تعمیر مہاتما جی کے اصولوں
پر ہوگی۔ ان اصولوں پر ہوگی جن کے لئے انہوں نے اپنی جان دیدی
شہادت کا جام پی لیا۔ اور جو اس بہار کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکے۔
جس کے لانے کے لئے انہوں نے اپنے جگر سے لالہ کاری کی تھی۔ اس
دامنِ صحرا میں اپنی آبلہ پائی سے گل بوٹے بنائے تھے۔ اور اپنے داغہائے
دل سے ان گنت، نت نئے اور رنگا رنگ پھول کھلانے کے لئے زمین
تیار کی تھی۔ آج خود بہار اپنی اس کس مپرسی اور زبوں حالی پہ آنسو بہا
رہی ہے، ماتم کر رہی ہے۔ اور یہ آواز بلند کر رہی ہے کہ خدارا بتاؤ
وہ لوگ کہاں چلے گئے۔ میری مشاطگی کا کام جن کے سپرد کیا گیا تھا، کہاں
سو گئے ہیں۔ وہ جو میرے بنانے اور سنوارنے کا دم بھرتے اور بلند بانگ
دعوے کرتے تھے؟ کس جگہ نیند آگئی ہے ان لوگوں کو جن کو میرا سہاگ

ایک مقدس امانت کی طرح سونپا گیا تھا۔

آج وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو مہاتما گاندھی نہیں چاہتے تھے آج وہ تمام خیالات عملی جامہ پہن رہے ہیں جن میں انھیں ہلاکت کی تصویریں ناچتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ آج وہ ہر بات حقیقت کا روپ اختیار کرتی ہوئی نظر آ رہی ہے جو کبھی ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں آتی تھی۔

اس اجمال کی تفصیل بڑی ہی دردناک ہے اگر اس کو سننا ہے تو اس کے لیے جگر تھام کے بیٹھنا ہوگا۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہر شخص کی نظروں کے سامنے نہیں ہے۔ جو باتیں ہو رہی ہیں ان کو کوئی بھی محسوس نہیں کر سکتا۔ ان کے اثرات بڑے دور رس ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت نے ابھی تک کچھ نہیں کیا ہے لیکن صوبائی حکومتوں نے جو پیش قدمی کی ہے وہ اس قدر حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے کہ معقولیت اور ترقی پسندی اس پر انگشت بدنداں ہے۔ نفرت کے سیلاب میں ایسے لوگ بھی آج بہے جا رہے ہیں جو کل تک متحدہ قومیت کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔ گاندھی جی کے نقش قدم پر چلنا اور ان کے افعال و اقوال پر عمل کرنا جن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ آج ان میں سے اکثر نے اپنا چولا بدل دیا ہے۔ آج نفرت کی اندھیاریوں نے ان کے خلوص کو ادھر ادھر بھٹکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کل تک جن باتوں کو وہ ہندوستانیوں کے لیے نامناسب اور نازیبا سمجھتے تھے آج انہیں کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ زمین و آسمان کے قلابے ملائے دے رہے ہیں۔

دوسرے صوبوں سے قطع نظر آج یو۔ پی کے صوبے میں ان لوگوں

کے ہاتھوں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کہیں نہیں مل سکتی۔ یو۔ پی میں اچانک اس زبان کو جو کئی سو سال سے اس صوبے کی سرکاری زبان تھی۔ حرفِ غلط کی طرح مٹا کر ایک نئی زبان کو رائج کرنے کے احکامات صادر کر دیئے گئے ہیں یعنی اردو کے مقابلے میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔ اور جس تیزی اور شدت کے ساتھ اس کو پھیلانے کے لئے ساری قوتیں صرف کی جا رہی ہیں اس تک تصوّر کی پرواز بھی نہیں پہونچ سکتی تھی۔ بات یہ ہے کہ یو۔ پی میں اس تحریک کے علمبردار یہ سمجھتے ہیں کہ اگر جلدی میں کچھ ہو گیا تو ہو گیا ورنہ ان کے لئے کچھ ہونے کی امید نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جس زبان کو یو۔ پی کے ان ارباب حل و عقد کی نفرت پھیلا رہی ہے۔ اس کو یو۔ پی میں نہ کوئی شخص بولتا ہے، نہ سمجھتا ہے لیکن اس کو صرف اس وجہ سے رائج کیا جا رہا ہے۔ کہ انھیں اردو سے خدا واسطے کا بیر ہے ہندی کی محبت کی بنیاد اردو سے نفرت پر استوار کی گئی ہے۔ ہر چند کہ یہ بھی بالکل ایک غیر فطری سی بات ہے۔ لیکن جہاں تک ہندی کی اشاعت کا تعلق ہے۔ اس سے کسی کو پرخاش نہیں ہے۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں، کرنا چاہتے ہیں، تو کیجئے، ضرور کیجئے۔ لیکن بڑا افسوس تو یہ ہے کہ انھیں ہندی کی اشاعت مقصود نہیں۔ اردو کو فنا کرنا ان کے پیش نظر ہے۔

ان سے اختلافات کی گنجائش نکلتی ہے اردو یو۔ پی کے تمام باشندوں کی زبان ہے۔ ہر شخص ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی معیاری اردو بولتا ہے۔ ایسی اردو بولتا ہے کہ سننے والے کو اس کے منہ سے پھول جھڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کو فنا کرنے کے

لئے ایسے ایسے منصوبے باندھے گئے ہیں۔ ایسی ایسی اسکیمیں بنالی گئی ہیں ایسے ایسے لائحہ عمل تیار کئے گئے ہیں جن کو دیکھکر حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور معقولیت کی آنکھیں خون روتی ہیں۔

اس سلسلے میں حال ہی میں یو۔ پی نے ابتدائی جماعتوں کے لئے جو نصاب تعلیم تیار کیا ہے۔ اس میں تو دھاندلی کی انتہا کردی ہے وہ موت کا پروانہ ہے اردو والوں کے لئے زہر کا جام ہے ان لوگوں کے لئے جو اردو کو اپنی مادری زبان کہتے ہیں۔ یہ نصاب تعلیم نہیں۔ نفرت، تعصب اور عناد کا برنز ہے۔ یہ ایک منظم تحریک کا شاخسانہ ہے۔ یہ تحریک کسی زبان کی اشاعت کی تحریک نہیں ہے۔ ایک زبان کو فنا کی نیند سلا دینے کی تحریک ہے۔ اس نصاب تعلیم میں ابتدائی جماعتوں میں پہلی زبان کی حیثیت ہندی کو حاصل ہوگی۔ اور ساری تعلیم اسی زبان میں ہوگی۔ حالانکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ بچے کو مادری زبان میں تعلیم دینی چاہیئے۔ لیکن مادری زبان ان کے خیال میں یو۔ پی کے ہر رہنے والے کی سنسکرت آمیز ہندی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے انھیں یہ کون سمجھائے کہ ہندوؤں کو اگر نظر انداز بھی کر دیا جائے تو کم از کم یو۔ پی میں رہنے والے صرف ایک کروڑ مسلمان ہی اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کی مادری زبان اردو ہے۔ پھر ان مسلمان بچوں کی تعلیم کا کیا حشر ہوگا جو اردو کو مادری زبان سمجھتے ہیں؟ اس کا کوئی جواب اس نصاب تعلیم میں موجود نہیں۔ موجود کیسے ہوتا۔ اردو والوں اور خصوصاً مسلمان اردو والوں کا وجود یو۔ پی کی حکومت کسی طرح تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس کی فسطائی ذہنیت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ تو ڈھال تلوار باندھے

ہوئے ہے۔ مقصد اس نصاب تعلیم کا یہی ہے کہ اگر اس پر دس سال بھی عمل ہوگیا تو پھر یو۔پی میں کوئی اردو داں باقی نہیں رہے گا۔ ایسا ہو یا نہ ہو لیکن بہرحال یہی سب کچھ سوچ کر اس کی تشکیل عمل میں آئی ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

یہ سب جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اردو کی جنم بھوم میں ہو رہا ہے ایسی جگہ ہو رہا ہے جہاں اردو پیدا ہوئی، پلی بڑھی، اور پھلی پھولی۔ جہاں کی زبان کو معیاری سمجھا جاتا ہے جس جگہ کی بول چال سے سند لی جاتی ہے۔ اور جہاں کے باشندوں کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک بول پر شیرینی اور گھلاوٹ نثار ہو جاتی ہے۔

مجھے یو۔پی کی حکومت سے کوئی شکایت نہیں۔ میں اس کی ہندی نوازی کا بھی شکوہ سنج نہیں ہوں کیونکہ ہندی تو مجھے خود عزیز ہے میں آج تک تلسی داس۔ سورداس۔ بہاری اور میرا بائی پر سر دھنتا ہوں۔ آج بھی سمترا نندن پنت۔ مہا دیوی ورما۔ بچن اور نریندر شرما کی نظمیں اور گیت میرا دل موہ لیتے ہیں۔ میں انھیں پڑھتا ہوں کیونکہ بہرحال ان کا شمار اعلیٰ پایہ کے ادب میں ہے۔ اور ایک ادیب کسی زبان کے ادب سے نفرت نہیں کرسکتا۔ میرے نزدیک بھاشا اور ہندی کی شاعری میرا سرمایہ ہے۔ ہندو مسلمانوں سب کا سرمایہ ہے چنانچہ میرا خیال ہے کہ ہندی والوں کو اردو اور اردو والوں کو ہندی پڑھنی چاہیے۔ تاکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ اور منافرت کی وہ دیوار جو بدیسی سامراج نے ہم دونوں کے درمیان حائل کردی تھی اور جس کے نتیجے میں ہم ایک دوسرے سے اجنبی ہوتے گئے تھے۔ اور جس میں

فرقہ پرست سیاست نے بھی خاصا حصہ لیا تھا کسی طرح راستے سے ہٹ جائے اور ہم پھر ایک ہو جائیں۔ لیکن بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ آزادی کی لڑائی کے آزمودہ کار سپاہیوں ہی کے ہاتھوں یہ اجنبیت کی خلیج آج اور وسیع سے وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔ ان میں سے اکثر آج بالکل بدل چکے ہیں۔ جس آئیڈیل کی خاطر کل تک انہوں نے اپنی جانوں تک کو جوکھوں میں ڈال دیا تھا۔ آج وہ اسی کی جڑ پر کلہاڑے چلا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے فرائض کو فراموش کر دیا ہے۔

یہ صورتِ حال ——— اور میرے خیال میں بڑی ہی بھیانک صورت حال ہے۔ لیکن یہ تو صرف ان مصیبتوں اور پریشانیوں کی تصویر کا صرف ایک رُخ اور پہلو ہے جس میں ہماری زبان آج گرفتار ہے اس پر تو زیادہ افسوس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ سب کچھ "غیروں" کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ اور غیروں سے کسی ایسی بات کی توقع کرنی جو اپنے مفاد کے لیے ہو ایک لایعنی سی بات ہے۔ لیکن موجِ خون سر سے تو اس وقت گزر جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غیروں کے ساتھ ساتھ اپنے بھی اس کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے درپے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتے۔ ان کے افعال و کردار کا براہِ راست یہ اثر نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی حرکتوں کے دور رس نتائج یہی ہوتے ہیں کہ زبان کے لئے ان میں سے ایک ایک زہرِ ہلاہل کا جام بن جاتی ہے۔

اس روداد کو بھی گوش گزار کرنے کے لئے دل کو بہتے خون میں ڈبونے کا اذن اور آنکھوں کو لہو ٹپکانے کی دعوت دینی ہوگی۔ یہ کہانی غیروں کی مخالفت سے کہیں زیادہ خونچکاں اور المناک ہے کیونکہ اپنے

ہی ہاتھوں اپنی قبر کھودنی بہرحال زیادہ قابل افسوس ہے۔

سب سے پہلے اس سلسلہ میں جس بات پر ہماری نظر پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے عام افراد میں زبان کا کچھ شعور نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بہت کم اردو داں ایسے ہیں جن کے دل میں کبھی اس خیال کی لہر آتی ہو کہ زبان کے لئے بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اردو والوں کی عام ذہنیت یہ ہے کہ زبان بس بولنے اور کام نکالنے کے لئے ہے اس لئے اس کے تحفظ اور بقا کے مسائل پر غور کرنا اور سر کھپانا عبث ہے۔ مثال کے طور پر یہ دیکھئے کہ آج اگرچہ اردو کا چراغ آندھیوں کی زد پر ہے۔ ہر طرف سے اس پر وار ہو رہے ہیں۔ اس کے سر پر موت ناچ رہی ہے لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ یو۔ پی کے صوبے میں اس مخالفت کا بازار سب سے زیادہ گرم ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہاں کی ساری اردو داں آبادی کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ نہ انہیں یہ فکر ہے کہ وہ زبان جس میں ان کی صدیوں کی روایات موجود ہیں ان کو کھٹل چھری سے ذبح کیا جا رہا ہے۔ اور نہ یہ خیال ہے کہ اگر اس کی مخالفت اس قدر شدت سے ہو رہی ہے تو اس کے لئے کوئی تعمیری کام ہی کریں۔ اس کے تحفظ اور بقا کے لئے کوئی منظم تحریک ہی چلائیں۔ کچھ روپیہ صرف کریں۔ ایک ایک گھر پر جا کر اس کے ایک ایک فرد کو اس پیغام سے باخبر کریں، کہ اگر حکومت اور اکثریت آج اس کو مٹانے کا تہیہ کر چکی ہے تو ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کو زندہ رکھیں۔ اردو والوں میں زبان کے متعلق کوئی تحریک نہیں پنپتی۔ کسی خیال کو عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا۔ اردو والوں کی آبادیاں نہیں قبرستان ہیں۔ اس میں چلتے پھرتے

انسان نظر نہیں آتے۔ سانس لیتے ہوئے مُردے دکھائی دیتے ہیں۔ لکھنؤ اس اس وقت اردو کی سب سے بڑی قتل گاہ ہے کیونکہ اس وقت اس کو فنا کرنے کے سارے منصوبے وہیں بنائے جا رہے ہیں۔ لیکن لکھنؤ کا ایک "اہلِ زبان" بھی اس پر چوں نہیں کرتا۔ کسی سے کہئے تو جواب ملیگا صاحب! حالات بے حد ناساز گار ہیں۔ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہئے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اگر آپ نے کچھ کیا تو آپ حکومت کے دشمن قرار پائیں گے فرمائیے اس کے بعد بھی کوئی کیا کہے۔ بزدلی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ اور آپ کو معلوم ہے ان میں سے ۹۰ فیصدی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی زمانے میں مسلمانوں کی قیادت کا دم بھرتے تھے۔ اور جو پاکستان کی سرزمین پر امن و آشتی کے پھریرے لہرانے کے لئے یہاں سے جاتے ہیں لیکن وہاں کی خاک ان کا ایسا دامن پکڑتی ہے کہ وہ پھر کسی طرح بھی واپس نہیں آتے۔ شاید اس وجہ سے کہ "اسلام" ہندوستان کی سرزمین پر خطرے سے باہر ہو چکا ہے۔ اب کوئی "پیرپور رپورٹ" یہاں تیار نہیں ہوتی۔ اب کوئی "سی۔ پی کا کانگریس راج" لکھنے والا یہاں باقی نہیں۔ پاکستان نہ ہوا ملک عدم ہوا کہ جو گیا اس کی خبر ہی نہیں آتی۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا۔ کہ ہند کے مسلمانوں کی خدمت اب وہ کر چکے ہیں۔ اب پاکستان میں ان کی ضرورت ہے۔ حالانکہ جو وقت یہاں کے لوگوں پر اس وقت پڑا ہے اس کے لئے واقعی کچھ کرنے کی ضرورت تھی۔ لیکن ان کے سامنے صرف لیڈری تھی۔ اسی کو انھوں نے پیشہ بنایا تھا وہ انکی روزی کا ذریعہ تھی۔ انھیں روزی مل گئی۔ ان کا مقصد پورا ہو گیا۔ اب اقلیتیں چاہے بھاڑ میں جائیں چاہے چولہے میں انھیں اس سے

کیا مطلب ۔

ان تمام تلخ حقائق کو بے نقاب کرنے سے میرا مطلب یہ ہے کہ ہماری سیاست غلط تھی۔ ہمارے سیاسی رہنما جو یہاں کے لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر جا رہے ہیں ۔ وہ خود غرض ہیں۔ ان کے پیش نظر کوئی تعمیری کام نہیں ہے ۔ انہوں نے عوام کو بیوقوف اور احمق بنایا اور زندگی بھر اپنا اُلو سیدھا کرتے رہے۔ اسی کا نتیجہ آج یہ ہوا ہے کہ عوام بے یار و مددگار ہیں اور ان میں احساس کمتری پیدا ہو چکا ہے کہ وہ زندگی سے بیزار بیٹھے ہیں۔ عمل کی دنیا میں اپاہج تو خیر وہ پہلے ہی سے تھے ۔ اب تو عمل کرنے کا خیال تک ان کے دل سے کافور ہو چکا ہے ۔

مسلمانوں کی سیاست کا ذکر میں نے اس وجہ سے کیا کہ اُردو کو وہی آج سینے سے لگائے ہوئے ہیں ۔ ورنہ زندگی کے ہر شعبہ میں پھیلتی ہوئی نفرت نے دوسروں کو تو اس سے بے نیاز کر دیا ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ اس میں اردو کے شیدائی موجود نہیں۔ میرا مطلب برادرانِ وطن کی اکثریت سے ہے جس نے آج اردو سے خدا واسطے کا بیر باندھ لیا ہے ۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ اس میں اردو کے شیدائی موجود نہیں ۔ انھیں میں اردو کے ایسے شیدائی بھی موجود ہیں جن کی ہستیوں کو اگر نمونہ بنا لیا جائے تو بڑی حد تک ہماری مشکلوں کا آسان ہو جانا یقینی ہے لیکن بڑا افسوس تو اس بات کا ہے کہ آج ہم خود اپنے اقوال و افعال سے ایک ایسی فضا پیدا کئے دے رہے ہیں جو ہمیں ان بچے کھچے اردو کے غیر مسلم شیدائیوں سے بھی دور کئے دے رہی ہے اس سے زیادہ اردو کے حق میں نادان دوستی اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس نادان دوستی کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ ایک حلقے میں اردو کو مسلم زبان کہا جا سکتا ہے۔ یہ پرانا حربہ ہے جو آج اس صورت میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ بات یہ ہے کہ عوام کے جذبات سے کھیل کر اس طرح زبان کی کسی تحریک کو بادی النظر میں آسانی کے ساتھ آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے دور رس نتائج بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں بعضوں نے اس سے ایک دفعہ پھر کام لینے کی کوشش کی ہے اور عوام کو اردو کے گرد وہ مذہبیت کے سہارے جمع کرنا چاہتے ہیں حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ اردو کی کلچرل، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت ان کے ذہن نشین کی جاتی۔ ان میں اس زبان کو حاصل کرنے کا ایک صحیح شعور پیدا کیا جاتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ راہ دشوار گزار تھی، اس پر چلنے میں وقت، سرمایہ اور محنت کا ہونا ضروری تھا اور ان تینوں چیزوں کو زبان کے لئے کون استعمال کرے۔ انھوں نے آسانی کی خاطر بس اردو کے مسلمان ہونے کا نعرہ بلند کر دیا تاکہ لوگ آسانی سے ان کے ساتھ ہو جائیں۔ اور ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر اس کی نشر و اشاعت میں حصہ لیں۔ اور اس کو عزیز رکھیں۔ کاش انھیں یہ بھی خیال ہوتا، کہ اپنی اس آسانی کی خاطر، وہ اس زبان کی بنیادیں ہلائے دے رہے ہیں جس کی اشاعت ان کے پیش نظر ہے۔ کاش ان کے ذہن میں یہ بات بھی آسکتی۔ کہ ان کے ایسا کرنے سے ان نظریات کی ساری عمارتیں ہلی جا رہی ہیں جن کو بڑی ہی غور و فکر کے بعد تعمیر کیا گیا ہے اور جن کی تعمیر میں ہمارے مفکروں نے زندگیاں صرف کر دی ہیں۔ ایسا کرنا اردو کی ساری اہمیت پر پانی پھیر دینا ہے۔ اور جو اردو زبان کی لسانیات

سے نا واقفیت پر مبنی ہے۔

اردو جس قدر مسلم ہے اسی قدر ہندو بھی ہے۔ اگر ہم لسانیات کی گہرائیوں میں نہ بھی جائیں تب بھی یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر ہندو اور مسلمان آپس میں نہ ملتے تو اس کا وجود ہی نہ ہوتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج سیاست میں پھیلی ہوئی نفرت نے ہندوؤں کو یہ اعلان کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اردو ان کی زبان نہیں ہے۔ اور بعض تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ اردو غیر ملکی زبان ہے۔ اور وہ زندگی بھر ہندوستان میں تفرقہ اندازی کے شعلوں کو ہوا دیتی رہی ہے لیکن ان تمام باتوں سے حقیقتوں پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی باتیں جانبداریت اور وہ بھی بغض اور نفرت پر استوار ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلم میں میل جول کی سب سے بڑی نشانی اگر وطن عزیز میں کوئی پائی جاتی ہے تو وہ صرف اردو ہے۔ اس پر ہندو مسلم ہونے کے لیبل نہیں لگائے جا سکتے۔ اس میں اگر قرآن کے ترجمے ہوتے ہیں تو گیتا کا ترجمہ بھی موجود ہے۔ اس میں اگر حدیث کی کتابیں موجود ہیں تو رامائن، مہابھارت اور ہندو مت کی دوسری کتابوں کا بھی ایک خاصا ذخیرہ ملتا ہے۔ اس میں اگر مسلم کلچر کے نمونے نظر آتے ہیں تو ساتھ ہی ہندوؤں کی قدیم تہذیب کی نشانیاں بھی ملتی ہیں۔ اس کے لکھنے والوں میں اگر مسلمان ہیں تو ساتھ ہی ہندو بھی ہیں۔ اس میں اگر میر، سودا، غالب، مومن، انیس، اقبال اور جوش پیدا ہوئے ہیں، تو پنڈت دیا شنکر نسیم، پنڈت رتن ناتھ سرشار، پنڈت برج نرائن چکبست، جوالا پرشاد برق، درگا سہائے سرور،

پنڈت برجموہن۔ دتاتریہ کیفی۔ پریم چند اور رگھوپتی سہائے فراق وغیرہ نے بھی جنم لیا ہے۔ اگر اس میں فیض، تاثیر، مجاز، ندیم، حفیظ، احسان، روش، ساغر، جذبی، احتشام، سجاد ظہیر، سردار، جواد، احمد عباس، پطرس، عصمت اور منٹو وغیرہ نے اپنی تخلیقات سے چار چاند لگائے ہیں۔ تو ساتھ ہی کرشن چندر، راجیندر سنگھ بیدی، اپندر ناتھ اشک، رامانند ساگر۔ وشوا متر عادل، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، جگر بریلوی، پنڈت کشن پرشاد کول۔ ریوتی سرن شرما، مدھوسودن، شمشیر سنگھ نرولا، پریم ناتھ در، کنہیا لال کپور وغیرہ نے بھی اپنے فن پاروں سے اس کو ہمدوش ثریا کر دیا ہے۔ پھر کوئی کس طرح اپنی آنکھوں پر تعصب کی پٹی باندھ کر یہ کہنے کی ہمت کر سکتا ہے کہ اس کا بھی کوئی مخصوص مذہب ہے

اس سلسلے میں دوسرا پہلو جو ہمیں نظر آتا ہے۔ وہ حد درجہ افسوسناک ہے۔ کہ بعض ادیبوں نے اس زبان کی ادبی دنیا میں فرقہ پرستی کے زہر کو پھیلانے کی کوشش کی ہے چنانچہ بعضوں نے حال ہی میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس زبان کے ہندو اور مسلمان ادیبوں کو علیحدہ علیحدہ اپنے مذہب کے مسائل کے علاوہ کسی ایسے موضوع پر لکھنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے جس سے ان کے آپس کے میل جول کا پتہ چلتا ہے۔ ان کا مطلب ہے کہ ہندو صرف ہندوؤں کے مسائل کے متعلق زیادہ خلوص کے ساتھ لکھ سکتا ہے اور مسلمان مسلمانوں کے متعلق۔ چنانچہ وہ بعض ہندو ادیبوں کی ایسی تخلیقات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینے کا حکم صادر کر دیتے ہیں جو انہوں نے مذہب کو چھوڑ کر صرف انسانیت کے نقطۂ نظر سے پیش کی ہیں۔ ان کی اس نادانی، کج روی، اور کم نگاہی پر سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے انھیں یہ کون سمجھائے کہ بھائی! ادیب کا مذہب انسانیت ہوتا ہے اس کی منزل محبت ہوتی ہے محبت ہی کو وہ زندگی کی اساس اور کائنات کا راز سمجھتا ہے ۔

اردو رسائل وصحائف اور زبان اردو

(از نکہت آرا بیگم نکہت)

موجودہ دور میں اردو روز افزوں وسعت اشاعت کے باوجود جس تیزی سے پستی کی طرف جارہی ہے اور اس کی بابت جن آئندہ خرابیوں کا اندیشہ ہے ادبی ذوق رکھنے والے حضرات سے کسی طرح پوشیدہ نہیں۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بام کمال تک پہونچنے کیلئے اردو منازل ارتقائی سے چل کر نہیں بلکہ دوڑ کر گزر رہی ہے۔ وہ تمام ذرائع جو کسی زبان کو معراج ترقی تک پہونچانے کا سبب ہوسکتے ہیں اسے تمام وکمال طور پر حاصل ہیں۔ اور اس کی نشر واشاعت میں شب و روز نہایت سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان حالات کو دیکھکر بجز اس کے کہ تابناک مستقبل کی پیشگوئی کی جائے۔ اور کیا کہنے کی جرأت ہوسکتی ہے لیکن ارباب بصیرت جانتے ہیں، کہ یہ جو کچھ نظر اس کی حقیقت ظاہری نمود ونمائش سے زیادہ نہیں یہ باتیں صرف سطحی نظر سے اندازہ کرنے والوں کی نظر فریبی کے لئے بہت کافی ہیں مگر اصلیت سے قطعی ناآشنا اور ترقی زبان کے حق میں بالکل غیر مفید۔

مولد ومنشاء ہونے کی وجہ سے اردو کو دلی سے ہمیشہ ایک تعلق رہا ہے۔ اور یہ تعلق کسی نہ کسی رنگ میں آج بھی صاف طور پر نمایاں ہے اب سے بیس سال پہلے جس نے دلی دیکھی ہو اگر آج جاکر دیکھے

اسے ایک دوسری دنیا نظر آئیگی، جس کے مادی جمال کو بڑھانے کے لئے تمام جدید اختراعات و ایجادات اور سائنس کی پوری قوتیں مصروف عمل ہیں۔ ویران منزلیں آباد ہوگئی ہیں۔ کشادہ سڑکیں عالیشان عمارتیں، ارکین سلطنت کے ایوان رات کو دن بنا دینے والی برقی روشنی کا اہتمام قدم قدم پر طرح طرح کے انتظام غرض اظہار شان و شوکت کا کوئی سامان نہیں جو موجود نہ ملے۔ اس ماحول میں پھر کر دلی کی ترقی کے متعلق کیا اس کے دل میں شک وشبہ کی گنجائش بھی ہو سکتی ہے؟ مگر آہ! وہی شخص ذرا دلی والوں سے جا کر دریافت کرے ہر شخص سے یہی سنیگا کہ دارالسلطنت ہو کر دلی نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔ دلی کا تمدن دلی کی معاشرت، دلی کی زبان سب مٹ گئے جو باقی رہ گئے ہیں وہ بھی مٹتے جا رہے ہیں۔ موجودہ شہر کوئی نئی آبادی ہے جو کہیں باہر سے آ کر آباد ہوگئی ہے جس میں دلی کی کسی بات کی جھلک تک نظر نہیں آتی۔

بعینہ یہی حالت اردو کی ہو رہی ہے۔ آج اس زبان کے مطالعہ کی جو کثرت ہے جس طرح ایک سے ایک بڑھکر وزنی ضخیم اور مصور رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں جو بہتات مصنفین اور مضمون نگاروں کی ہے جو فراوانی شعرا کی ہے اس سے قبل کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ یہی چیزیں ہیں جن پر کسی زبان کی ترقی اور نشو و نما کا دار و مدار ہوتا ہے۔ لیکن نہایت حسرت کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ کہ یہی چیزیں اپنی بے راہ روی کی وجہ سے زبان کو شاہراہ ترقی کی طرف لے جانے کے بجائے کمال بیدردی سے پستی کے گڑھے میں ڈھکیل رہی ہیں۔

اظہار شان و عظمت کا خیال بڑھتا جاتا ہے۔ نمود و نمائش کا جذبہ ترقی کرتا جاتا ہے مگر اردو کا جگر مجروح ہو رہا ہے۔ اور اگر ان امور کا سدباب بروقت نہ کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب اردو اپنی اعتباری خوبیوں کو کھو بیٹھے اور ادبی خصوصیات سے مضمون زیر نظر میں میرا روئے سخن ان حضرات کی طرف نہیں ہے جو صحیح معنوں میں اردو کی خدمت کر رہے ہیں بلکہ ان لوگوں سے خطاب ہے جو اشاعت اردو کا نام لیکر زبان و ادب کی مٹی برباد کر رہے ہیں۔

ان لوگوں میں سب سے زیادہ خطرناک وہ کم لیاقت مدیران جرائد ہیں جو محض ذاتی منفعت کے لئے ادارت کی گرانبار ذمہ داریاں اپنے کمزور کندھوں پر اٹھا لیتے ہیں۔ متمدن ممالک میں ایڈیٹروں کی باقاعدہ تعلیم کے انتظامات ہیں۔ نصاب مقرر ہیں۔ کافی عرصہ تک تعلیم دی جاتی ہے۔ امتحان لئے جاتے ہیں۔ بعد کامیابی عملی تجربہ حاصل کرایا جاتا ہے۔ ان مراحل کو طے کرنے کے بعد عنان ادارت ان کے ہاتھ میں دی جاتی ہے۔ پھر ان کی زیر نگرانی جو رسائل و صحائف شائع ہوتے ہیں۔ وہ علم و ادب کے آئینے اور زبان کا معیار ہوتے ہیں۔ مگر دنیائے اردو ان تمام اصول و قیود سے یکسر آزاد ہے۔ یہاں اجرائے جرائد کے صرف دو نظریے ہیں۔ تجارت اور شہرت۔ باقی تمام مقاصد کو ان پر قربان کر دیا جاتا ہے یہاں ہر ناکامیاب فرد حصول رزق کے تمام دروازے سے اپنے اوپر بند پاکر یا جنون شہرت سے مغلوب ہو کر میدان صحافت ہی کو اپنی آخری جولانگاہ بنا تا ہے۔ اور اسی کو اپنے لئے معراج تصور کرتا ہے۔ کہ ہر رطب و یابس سے جو کچھ میسر آجائے

رسالہ کا پیٹ بھر دے۔ اور سربراہ ایک "مجلہ علمیہ وادبیہ" منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جائے ایسے افراد میں عموماً نہ انتخاب مضامین کی اہلیت ہوتی ہے اور نہ ترمیم و اصلاح کی لیاقت بلکہ اکثر اپنے رسائل کے شذرات کے لئے بھی دوسرے اہل قلم کے رہین منت ہوتے ہیں۔ اس قسم کے نام نہاد مدیر تجارتی نقطۂ نظر کی مجبوریوں کے باعث دیدہ و دانستہ بلکہ خاص اہتمام کے ساتھ اپنے رسائل کا مذاق اس لئے پست و عریاں کر دیتے ہیں کہ عوام اور بازاری لوگوں سے جن کی تعداد ہر ملک میں بہت زیادہ ہوتی ہے سند پسندیدگی حاصل کریں۔ اور انہیں اپنا خریدار بنائیں۔ اردو رسالوں کی یہ ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر میں نے ایک مطبوعہ خط کے ذریعہ ان کے مدیروں کی توجہات کو اس جانب مبذول کر دیا تھا۔ کہ وہ پست اور ناکارہ مضامین کی اشاعت سے اجتناب کریں۔ اور جہاں انہوں نے رسالہ کی ادارت فرما کر ملک کی حالت پر کرم فرمایا ہے وہاں زبان اردو کے حال پر بھی رحم فرمائیں۔ اگر ان کو اچھے اور بلند پایہ مضامین نظم و نثر میسر نہیں آتے تو بزم ادب کی خدمات ان کے لئے وقف ہیں اب یہاں یہ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کہ بعض نے جواب کی طرف سے قطعی خاموشی اختیار کی اور بعض حضرات نے یہ جواب ارسال فرمایا کہ مذاق عوام کے خلاف لکھنا رسالہ کی موت کے مترادف ہے۔ اس لئے غیر ممکن۔ لیکن یہی رسائل جب منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں کس بلند آہنگی سے اردو کی خدمت کا دعویٰ کرتے ہیں۔

اردو کی تباہی اور بربادی کے سامان ملک کے نااہل مضمون نگار اور نام نہاد ادیب ہیں جو رسائل کے لئے پست مضامین تیار کرتے ہیں۔

اور انگریزی رسالوں سے صرف عریانیوں کی نقل کرکے ملک کا مذاق بگاڑتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں ہر مضمون نویس اپنے مذاق کے مطابق ایک شعبہ اختیار کر لیتا ہے۔ کثرت مطالعہ کے ذریعہ اس خاص شعبہ فن میں دستگاہ بہم پہونچاتا ہے۔ اور کافی علم و معلومات حاصل کرنے کے بعد اپنے موضوع پر قلم اٹھاتا ہے۔ مگر اردو مضمون نگار ان امور سے بے نیاز ہے ہر نوجوان جہاں ذرا شد بد سے واقف ہو گیا اور دو چار رسالے دیکھ لئے۔ بس مضمون نگاری کی لیاقت پیدا ہو گئی۔ ادھر جو کچھ دل میں آیا اس سے کاغذ سیاہ کرنا شروع کیا۔ ادھر اس کے ہمجنس ایڈیٹروں نے فتوحات غیبی سمجھکر مضمون اس کا نام رکھدیا۔ اور اپنے رسالہ میں چھاپکر فرائض ادارت کو ادا کر دیا۔ نہ املا کی خبر نہ انشاء سے غرض نہ زبان کی پرواہ نہ ادب سے واسطہ۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ کوئی اپنے لئے کوئی موضوع خاص نہیں کرتا بلکہ ہر مضمون نگار بیک وقت علمی، اخلاقی ادبی، مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور خدا معلوم کس کس عنوان پر مضمون لکھدیتا ہے۔ لیکن جس طرح اسکول کے درجنوں مضامین میں تعلیم پاکر ہر مضمون میں یہ لوگ کورے سے رہتے ہیں اسی مناسبت سے ان کا ہر مضمون سراسر ناقص اور ہر خوبی سے عاری ہوتا ہے۔ چنانچہ آجکل کے اکثر رسائل کو اکٹھا کر دیکھ لیا جائے کتنے مضامین اعتنائی کے لائق ہوتے ہیں؟ کتنے مضامین کے ذریعہ جدید تحقیقات و انکشافات کی راہیں کھولی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا ضرور ہوتی ہے کہ پرانے مضامین کسی قدر تحریف کے بعد اپنے بنا لئے جاتے ہیں۔ اور اس تغیر و تبدل سے اصل مضمون کی ساری خوبیاں خاک میں ملا دی جاتی ہیں۔ یہ مخلوق اسی غلط راستے

پر چلتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مدت کی مضمون نویسی اور فراغت تعلیم کے بعد بھی یونہی سی رہتی ہے۔ بکثرت ایسے مضمون نگار اور افسانہ نویس میری نظر سے گذرے ہیں جن کی علمی معلومات باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے افسوسناک طریقہ سے محدود ہیں معمولی سے معمولی علمی مسئلہ کے سمجھنے سے قاصر ہیں جن کی زبان پر اردو کا کوئی محاورہ درست نہیں۔ مگر بزعم خود اردو کے ماہر اور انشاء پرداز بنے بیٹھے ہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے۔ کہ جب ایسے لوگ جائز و ناجائز وسائل اختیار کرکے ملک میں اپنے "اثرات قلم" پھیلاتے ہیں۔ اور جب نومشق لوگ زبان و ادب سیکھنے کے لئے انہی کی پیروی کرتے ہیں تو ایک لامتناہی سلسلہ زبان و مذاق کی خرابی و بربادی کا شروع ہوجاتا ہے۔ یہ سلسلہ ختم ہونے سے رہا۔ اور اردو کی خیر و عافیت معلوم۔

اردو کے لغو اور مہمل رسالوں اور نااہل مضامین نگاروں کے علاوہ زبان کی خرابی کا تیسرا سبب نوجوان طبقہ کے آزاد و بے راہرو مدعیان شعر و سخن ہیں۔ یہ حضرات زبان کے حق میں مذکورہ بالا لوگوں سے زیادہ مہلک جراثیم ہیں۔ نثر کی فروگذاشت قابل درگذر ہو بھی سکتی ہے مگر نظم میں ادنیٰ ترین لغزش سے بھی چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ وجہ یہ ہے کہ شعراء کو ملک و قوم کا ترجمان سمجھا جاتا ہے۔ ان کا بیان قوم کے اخلاق و افکار کا آئینہ اور ادبی کمالات کا نمونہ ہوتا ہے یہی لوگ زبان کے بنانے والے اور ادبی معیار کے قائم رکھنے والے ہوتے ہیں الفاظ و محاورات کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ انہی کے کلام سے کیا جاتا ہے اور کسی قوم کی ادبی ترقیوں کی بحث میں انہی کا کلام ثبوت پیش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ ہر زبان کے اساتذۂ فن نے شعرا کے معاملہ میں نہایت سخت گیری سے کام لیا ہے۔ اور معمولی سے معمولی سہو کو بھی جائز قرار نہیں رکھا۔ اسی باعث نظم لکھنے کے لئے بہ نسبت نثر لکھنے کے زیادہ مشق محنت اور احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے جدید قسم کے نوعمر شعرا ان چیزوں سے بہت گھبراتے ہیں۔ اور اس طبقہ میں عموماً وہ جدید تعلیم یافتہ اور آرام طلب حضرات شامل ہیں۔ جو ہر معاملہ میں دخل در معقولات کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ اور کسی علم کے صرف مبادیات جان کر اپنے آپ کو محقق ثابت کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ یہ لوگ واقفانِ فن کے اعتراضات سے نہایت چالاکی کے ساتھ بچنے کے لئے اصول و قواعد کو زبان کے حق میں مضر اور سدِّ راہ ظاہر کرتے ہیں اور اس طفلانہ فریب دہی سے مطمئن ہو کر زبان و ادب میں وہ گندگی پھیلاتے ہیں کہ معاذ اللہ بعض صاحبان جدتِ طبع سے مجبور ہو کر انگریزی قسم کی نظمیں لکھتے ہیں جن میں انگریزی قواعد کی پابندی اس لئے نہیں کی جاتی کہ نظم اردو میں لکھی گئی ہے اور قیودِ اردو سے اس لئے آزادی رہتی ہے کہ نظم انگریزی وضع کی تصنیف فرمائی گئی ہے۔ افسوس کہ اس عجیب الخلقت مخلوقات کے لئے نہ انگلستان میں کوئی عجائب خانہ تعمیر کیا گیا ہے اور نہ ہندوستان میں پھر کر یہ بلا ہندوستان کے سر رہتی ہے اور نہایت آزادی سے زبان کی مٹی پلید کرتی ہے۔

زبان کی خرابی کا چوتھا اور بڑا سبب وہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جو مذاق سلیم بھی رکھتے ہیں اور اردو کی خدمت بھی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن انگریزی ادبیات سے اس درجہ متاثر ہو چکے ہیں کہ ان کی اردو کی

تحریر انگریزی ادب کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے اور زبان اردو کی کوئی خصوصیت اس میں نہیں پائی جاتی۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ابتدائے تعلیم سے انتہا تک ساری کوشش انگریزی زبان کی تحصیل و تکمیل میں صرف کی جاتی ہے۔ تمام مضامین انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اردو تو محض برائے بیت ہوتی ہے اور وہ بھی اختیاری۔ تعلیم گاہوں میں کھیل کے میدانوں میں، نجی ملاقاتوں میں زیادہ تر انگریزی ہی سے کام رہتا ہے۔ اردو میں بات چیت کی بھی اجازت نہیں دی جاتی۔ اٹھارہ بیس سال مسلسل اسی ماحول میں رہنا پڑتا ہے۔ تعلیم حاصل کر کے جب یہ نوجوان کالج کی چار دیواری سے باہر نکلتے ہیں۔ اخلاق و عادات اور خیالات پختہ ہو چکتے ہیں۔ اور دل و دماغ نئے اثرات قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ اس وقت یہ نوجوان ہندوستانی نما انگریز ہوتے ہیں۔ جن کی تحریر و تقریر نشست و برخاست مکالمت و مخاطبت سب انگریزی سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں اس کے علاوہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں کی زبان میں کمال حاصل کرنا چاہتا ہے۔ تو خود اپنی زبان خراب کر لیتا ہے۔ ایک انگریزی شاعر ڈرائیڈن افسوس کیا کرتا تھا کہ میں نے لاطینی زبان کیوں سیکھی۔ کہ میری اپنی زبان خراب ہو گئی" مثال اور مقابلے کے طور پر اپنے ملک کے علمائے زبان عربی کی اردو تصانیف ملاحظہ فرمایئے۔ ان کی صرفی نحوی اور لغوی تحقیق میں کسے شک ہو سکتا ہے۔ عربی ادبیات پر کس قدر عبور ہوتا ہے۔ فصاحت و بلاغت کی خوبیوں پر کیسی وسیع نظر ہوتی ہے۔ مگر یہی باکمال جب اردو لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہی عربی

انداز کی انشاء وہی ترکیبیں، وہی اصطلاح۔ اسی طرح جملوں کی نشست
غیر مانوس اسلوب بیان۔ کیا اس قسم کی تحریر ادب اردو کا نمونہ کہی
جا سکتی ہے؟ حالانکہ اردو کو عربی سے ایک گونہ نسبت بھی ہے۔
اور تحصیل علوم عربی کے دوران میں طلبہ کو عربیت سے اس قدر متاثر
کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ پھر انگریزی طرز کی تحریر
جسے اردو سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ادب اردو کا اطلاق کس
طرح ہو سکتا ہے۔ اس قسم کی تحریریں اردو میں کوئی مفید اضافہ نہیں
کرتیں۔ بلکہ اس کی خصوصیات کو ناقابل تلافی نقصان پہونچانے کا
باعث ہو رہی ہیں۔

زبان اردو کی بربادی کا آخری مگر سب سے بڑا سبب وہ سبب
جو تمام خرابیوں کا باعث ہے محققین زبان اور ماہرین ادب کی
بیجا خاموشی ہے۔ غلطی کا ارتکاب انسانی فطرت میں مضمر ہے اور
اس سے اسی وقت بچ سکتا ہے۔ جب کوئی آگاہ کرنے والا ہو ورنہ
گمراہیوں میں بڑھتا جائے گا۔ یہاں تک کہ خود مٹ جائے گا۔
اور دوسروں کے مٹنے کا سبب ہوگا۔ اور اس عام بربادی کے
ذمہ دار وجواب دہ آئندہ نسلوں کے روبرو وہ لوگ ہوں گے جو اپنا
فرض ترک کرکے ایک مخلوق کی ہلاکت کا تماشہ دیکھتے رہے۔ میں ذرا
ان حضرات سے دریافت کرنا چاہتا ہوں جو زبان دانی کا دعویٰ کرتے
ہیں کہ آپ میں سے کتنے ہیں جو زبان اردو کی ترقی کے لئے کوشاں ہیں؟
اسے مخالفین کے حملوں سے بچانے ہیں کتنے اصلاحی ادارے ہیں؟ کتنے
نقاد کام کر رہے ہیں؟ کتنے اصلاحی مضامین ہر ماہ شائع ہوتے ہیں؟

یہ اردو کی خدمت نہیں کہ ہر ماہ ایک مشاعرہ کر دیا۔ عمر بھر میں ایک
آدھ دیوان یا کتاب لکھ ڈالی۔ اس پُرآشوب زمانے میں اس کم
مائیگی سے کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ آج اردو پر ہر طرف سے
حملے ہو رہے ہیں۔ طرح طرح کی تدبیروں اور سازشوں سے اس کی
خوبیوں کو فنا کیا جا رہا ہے بعض اعلانیہ دشمن ہیں بعض دوست
نما دشمن ہیں۔ بعض نادان دوست ہیں۔ جو دشمن سے بھی بدتر ہیں
اس ہجوم بلا کا مقابلہ ایک حد تک ادارہ پیام ادب کرتا رہا لیکن
اب یہ کس کس کی اصلاح کرینگے۔ کہاں کہاں کی خبر رکھیں گے اس
لئے ضروری ہے ہر ادب نواز اردو کی ترقی اور تحفظ کے لئے کمربستہ
ہو جائے۔ اور ساری ہمت اس سرسبز باغ کو خس و خاشاک سے
پاک کرنے میں کر دے۔ اور جس طرح آج بنارس میں پیام ادب کے
اراکین مختلف ادبی خدمات کی انجام دہی کے ساتھ زبان کی جانب
متوجہ ہیں اسی طرح اگر ہمدردان اردو نے توجہ کی اور ملک کے گوشہ گوشہ
میں انجمن کی شاخ قائم کر کے اپنی زبان کے تحفظ اور ترقی کے لئے
ایک خاص جوش کے ساتھ عمل پذیر ہوں گے۔ تو بہت جلد اردو کو
حملہ خرابیوں سے بچا کر ترقی کے اعلےٰ مدارج پر پہونچا دینگے۔

پیام ادب بلحاظ اپنی کم عمری زیادہ مشہور نہ ہو لیکن بلحاظ اپنے
کام ایک بہترین ادارہ ہے جو ملک میں ادب اردو اور زبان کی خدمت
کر رہا ہے سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خاموش خدمت کر رہا ہے
پروپیگنڈے کے نقارے اس کے ساتھ نہیں۔ پیام ادب خاموش
کام کرنے والوں کا ایک ادارہ ہے۔ جس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ
شامل ہیں۔ انجمن نے اردو زبان و ادب کی ترقی و تعمیر میں جو کچھ محنت کی ہے وہ

سخن ہائے گفتنی

(از مؤلف)

پندرہ اگست ۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اس کے پیروں میں غلامی کی بوجھل زنجیریں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کی گردن ذلت ونکبت کے آہنی طوق سے جھکی جا رہی تھی۔ اب انسانی نگاہوں میں نہ وہ بیڑی ہے نہ وہ طوق۔ ان حالات میں چہروں پر مسرت وشادمانی کھیلنی چاہیے تھی۔ ہر شخص کو خوشی کا شادیانہ بجانا چاہیے تھا۔ لیکن بجائے مسرت وشادمانی غم واندوہ کے بادل چھائے جا رہے ہیں۔ کچھ کے چہروں پر بناوٹی مسکراہٹ ہے اور کچھ آہ وفغاں میں مصروف ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ ہم آزاد ہیں اور یہاں کی رہنے والی اقلیت غلام۔ اقلیت کو کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ بار بار اس سے وفاداری کا ثبوت طلب کیا جا رہا ہے۔ اس کے دماغ پہ آزادی سے پہلے کے اثرات چھائے ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکی۔ کہ ہند کی اقلیت ملک کی وفادار ہے یا باغی۔ وہ اقلیت کی زبان سے اس کا اقرار چاہتی ہے۔

لیکن اقلیت اپنی وفاداری کا اتنا گھٹیا ثبوت دینا اپنی توہین سمجھتی ہے۔ جب سر اور دھڑ کی بازی لگانے کا وقت آئیگا اس وقت دنیا پر روشن ہو جائے گا کہ کون باغی ہے اور کون غدار۔ ہندوستان کی حکومت ایک ایسے انوکھے اصول کی پیداوار ہے

جس میں خون بہانا گناہ ہے اس لئے ہم یہ کبھی نہ چاہیں گے کہ اس زمین پر دانستہ طور پر کشت و خون کے ہمیان باندھے جائیں۔ اور اگر مجبوراً ایسا ہوا تو ہم یہ گناہ کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ ایک پاکستان تو کیا اگر ساری دنیا بھی سامنے آئے گی تو اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینگے جو ہمارا محافظ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے۔

اقلیت کو بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے اور اس کے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ شاید ہماری زندگی مشکوک ہے بلکہ وہ دل ہی دل میں یہ خیال کرتی ہے کہ یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے آپ سوال کریں گے کہ آخر یہ احساس پیدا کس طرح ہوا۔ سنئے میں آپ کو بتلاتا ہوں۔

دورِ غلامی کے بعد مسلمانوں کا قدم اٹھا اور منزل کی طرف اٹھا اس نے چلنا شروع کیا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جبکہ ہندوستان کے تمام بسنے والے منزل سے ناآشنا تھے۔ کسی کو بھی منزل کا پتہ نہیں معلوم تھا۔

آج کے بڑے بڑے سیاست دان اور گئی ہوئی حکومت کے باغی اس وقت حکومت کے وفادار تھے۔ وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ مگر مسلمان تیزی کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ منزل شناس قدم منزل تک پہونچنے والا تھا کہ یکبارگی پکار سنے والے نے پکارا، راہ کے نہ جاننے والے نے روکا۔ اور ساتھ چلنے کی آرزو کی اس نے غلطی کی گھوم کر دیکھا۔ قدموں کو روک کر انتظار کیا اور کم کچھ عداوتاً کو ساتھ لے چلنے پر تیار ہو گیا۔

یہ کوئی نئی بات نہ تھی اس کی فطرت میں یہ داخل تھا کہ گم کردہ راہ کو راہ دکھائے اور منزل سے ناآشنا قافلوں کو منزل تک پہنچائے مگر یہ کبھی بھی نہیں ہوا۔ کہ راہ بھٹکے ہوئے قافلوں کا اس نے انتظار کیا ہو اور پیر توڑ کر اس وقت تک بیٹھا رہا ہو۔ جب وہ بھولا ہوا قافلہ ٹھوکریں کھاتا ہوا اس تک نہ پہونچ جائے۔ مگر یہ ہوا اور ہندوستان میں اور دونوں نے ساتھ چلنا شروع کیا اور اس غربت کے عالم میں چلنا شروع کیا کہ منزل شناس قدموں پر منزل کا سراغ گم ہو گیا اور اس نے گم کردہ راہ انسانوں سے اس مقام پر پہونچکر منزل کا پتہ دریافت کیا ہو جبکہ منزل بالکل قریب تھی۔ مگر تراہا تھا اور تراہا بھی ایسا کہ جس کا ہر موڑ منزل کی طرف تھا۔ ایک راہ صاف قافلوں کے لئے۔ دوسری پہاڑ والے درندوں کے لئے اور تیسری ان مویشیوں کے لئے جن کی ذات انسان کے لئے نفع بخش۔

خیال کیجئے کہ اس مقام پر پہونچکر راستہ بھول جانا اور راہ نہ جاننے والے سے راہ دریافت کرنا کتنی بڑی غلطی ہے۔ مگر مسلمانوں نے ہندوستان میں ایسا ہی کیا جب منزل قریب آئی تو گم کردہ راہ انسانوں کی دلکش سحر آگیں گفتگو میں پھنس کر نشانِ منزل گم کر دیا۔ اور منزل کا پتہ ان سے پوچھنے لگا جنہوں نے خود اسے روک کر ساتھ چلنے کی آرزو کی تھی اور وفادارانہ طریقہ سے اطاعت کا سر خم کئے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

راہ پوچھنے سے نتیجہ یہ نکلا۔ کہ گم کردہ راہ ساتھی مسکرایا اور اس نے تراہے کی ہر راہ کو غور سے دیکھا۔ ایک راہ پر کچھ انسانی نقوش نظر آئے مگر یہ نقوش اتنے دھندلے تھے کہ جب تک نظریں نہ گاڑی جائیں اس

وقت تک پتہ چلانا مشکل تھا اس نے یہی کیا اور منزل سے آشنا انسانوں سے جو مکر میں پھنس کر منزل کو بھول چکے تھے۔ کہا آؤ چلو میں بھی منزل جانتا ہوں اور تم کو منزل تک پہونچاؤں گا۔ منزل دور تھی۔ مگر ایک مقام کو منزل سمجھکر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا یہی منزل ہے۔

راہ میں باتیں بھی ہوئیں باتوں میں کچھ مطالبات تھے کچھ معاہدات اور مواعید بھی تھے۔ ہر مطالبے کا جواب یہی تھا کہ ہم تم ساتھی ہیں ایک منزل کی طرف جانے والے ہیں۔ مدعا ایک ہے مقصد مشترک منزل بھی ایک ہے تو پھر مطالبہ کیسا؟ جب برابر کی شرکت ہے تو نفع بھی برابر ہی کا اور ہر چیز برابر کی۔ وعدوں کو جب یاد دلایا گیا تو جواب ملا کہ ایک ایک بات یاد ہے پھر آپ کے احسانات بھی ہیں۔ ہم پہ منزل گم تھی۔ آپ نے راہ دکھائی اور اس وقت تک ساتھ بھی دیا پھر انحراف کیسا۔ جہاں تک معاہدات کا تعلق ہے۔ عہد شکنی انسان کا شیوہ نہیں۔ حالات بتلائیں گے وقت بتلائے گا کہ ہم اس پہ کس حد تک قائم ہیں۔

منزل پر پہونچنے کے بعد نہ عہد کی ایفا کا خیال نہ مواعید پر نظر نہ مطالبات پہ توجہ۔ بلکہ الٹا شکوہ یہ تم نے راہ میں مشکلات پیدا کیں۔ ہم تو کب کے منزل تک پہونچ جاتے۔ تم نے راہ میں کانٹے بچھائے کنکر و پتھر کا انبار لگایا۔ یہ منزل تو ہم نے حاصل کی ہے۔ تم نے تو اپنا حق راستے ہی میں بانٹ لیا۔ اس میں تمہارا حق تو نہیں۔ جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ وہ ہم نہ تھے بلکہ جو شکل و صورت کے اعتبار سے ہم سے لگا آنے تھے لیکن ہم تو تمہارے ساتھ تھے نہیں

نہیں بلکہ تم سے آگے تھے ہمیں تو منزل کی طرف لے جارہے تھے جب ہندوستان کا روحانی پیشوا سیاسی رہنما فوج کی بھرتی دے رہا تھا اس وقت ہمیں تو تھے ہمارا ہی امامؒ ابوالکلام" تو تھا جو فوج کی بھرتی کا بائیکاٹ کر رہا تھا۔ ولایتی مال کا بائیکاٹ اس کا نصب العین تھا۔ اس کا قلم آگ برسا رہا تھا آزادی کی دبی ہوئی چنگاری کو ابھار رہا تھا۔ غدر ۵۷ء کو انقلاب ۵۷ء میں تبدیل کرنا چاہتا تھا اور غیر ملکی اقتدار سے ملک کو نجات دلا کر اس منزل پر پہونچانا چاہتا تھا جو ہندوستان کی حقیقی منزل تھی۔ کیا سنہ ۱۶ء سے سنہ ۱۸ء تک کا زمانہ یاد نہیں کیا سنہ ۲۰ء سنہ ۲۱ء اور سنہ ۲۲ء کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت کس کا قدم آگے تھا؟ کون منزل کی طرف جا رہا تھا؟ کس نے آواز دے کر روکا تھا؟ کس نے ساتھ چلنے کی تمنا کی تھی؟ کون ہماری قیادت تسلیم کرنے کا آرزومند تھا؟ کیا وہ تم نہ تھے؟

ہاں ٹھیک ہے وہ ہم تھے ہمیں اس کا اقرار ہے لیکن جب ہم نے تم کو پکارا اور تمھارے ساتھ چلنے کی تمنا کی کہ تم پیر توڑ کر بیٹھ چکے تھے اور ہم اکیلے منزل کی طرف جا رہے تھے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ کچھ تمھارے قدم بھی تھے۔ مگر راہ میں دشواریاں پیدا کرنے والے بھی تمھارے ہی آدمی تھے۔ کل چاہے ہم انکار کر دیں مگر آج اقرار ہے ہاں اکثریت کی بے راہ روی اقلیت کو لے ڈوبتی ہے ہندوستان میں یہی ہوا اور ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہماری اکثریت ہم کو لے ڈوبی اور اب ملکی اکثریت ہم کو اس منزل تک پہونچانا چاہتی ہے جو منزل ہماری منزل نہیں تھی

ان حالات میں ہم کو کیا کرنا ہے؟ یہی وہ اصل بات ہے جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے اگر اس وقت ہم نے توجہ نہ دی تو پھر دوبارہ زمانہ ہم کو سوچنے کی مہلت بھی نہ دے گا۔

دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے
ہاتھ اپنے دونوں نکلے کام کے

آپ ہم سے پوچھیں گے کہ ہمارا تبلایا ہوا علاج شاید مفید نہ ثابت ہو پھر بھی بات جو کہنی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت مسلمان کا اول فریضہ یہ ہے کہ خوف و ہراس اپنے دل سے دور کرے۔ اپنے اوپر اعتماد کرے خدا کی رحمت پر بھروسہ کرے اور یقین کرے کہ ہماری جان نہیں ہمارا مال ہمارا مال نہیں عزت وآبرو جو کچھ ہے اس کا مالک دوسرا ہے اور ہم اس کو ایک ایسے گوہر گراں مایہ کے عوض فروخت کر چکے ہیں جس کی قیمت پوری کا ئنات سستی ہے۔

جب یہ عقیدہ ہے اور بنیادی عقیدہ ہے تو پھر موت کا خوف کیسا؟ اور جب موت کا خوف نہیں تو پھر کامیابی یقینی ہے۔

پھر بھی کچھ ایسے عملی مسلمان کی ضرورت ہے جو بغیر کسی لالچ بغیر کسی امتیاز کے بنی نوع انسان کے خدمت کا جذبہ رکھتے ہوں یہی چیز آج مفقود ہو گئی ہے اگر ہم نے مخلصین کی ایک ایسی جماعت تیار کر لی جس کا ایک ایک فرد مجاہد ہو اور اپنے کو اللہ کا سپاہی تصور کرتا ہو اس پر اچھی طرح کاربند ہو کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ تو پھر یقین مانئے کہ وہ دن دور نہیں

کہ جب طبقاتی کشمکش سے اکتا کر وہ قوم جس نے آج ہم کو ٹھکرا دیا ہے کل جب سوشل ریفارم چاہے گی تو اس کے سامنے ایک نمونہ موجود ہوگا۔ وہ نمونہ انہیں مخلصین کا ہوگا۔ جو خاص جذبہ کے ماتحت میدان عمل میں گامزن ہوں گے۔

یہ علاج ہمارا سوچا سمجھا یا ہمارا اپنایا ہوا نہیں بلکہ حقیقتاً کتاب سنت سے ماخوذ ہے ہاں اس کو آج جس نظریئے کے ماتحت پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ حالات حاضرہ کا تقاضا اور وقت کی خاموش اور صحیح پکار ہے۔

رہا معاشی مشکلات کا سوال تو اس کے متعلق میرا خیال ہے کہ مسلمان کو سروس کا خیال ہی دل سے نکال دینا چاہیئے اور جب یہ کہا بھی جاسکے کہ چودہ فیصدی یا بارہ فیصدی تمہارا حق ہے وہ تم کو ملے گا۔

اس کا جواب اصولی طور پر یہ ہے کہ جو ذات کائنات کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئی تھی اور جس کی زندگی ہر انسان کے لئے نمونہ اور مشعل راہ ہے۔ اس کی زندگی میں اگر کوئی چیز نہیں ملتی۔ تو اس غلامی کے لئے نمونہ نہیں ملتی اس لئے ہم نہ ملازمت کے سہارے جیتے ہیں۔ اور نہ جینا چاہتے ہیں۔

جس طرح ہندوستان کے ساڑھے چار کروڑ مسلمان زندگی بسر کرینگے وہاں ہندوستان کے یہ چند لاکھ بھی جو ملازمتوں کے سہارے زندہ رہ سکتے ہیں وہ بھی رہیں گے۔

ہاں بنیادی طور پر ابھی ہمیں اور بھی بہت سا کام انجام دینا ہے۔

اسی میں سے ایک زبان کا مسئلہ ہے۔ اسے بھی خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھانا ہے۔

کیونکہ اب دیش آزاد ہو چکا ہے ضروری ہے کہ موجودہ تباہی اور بربادی پر غور کیا جائے چہروں پر جو حزن و ملال کے آثار ہیں، ان کو دور کیا جائے اور کھل کر موجودہ نظام حکمرانی پر گفتگو کی جائے۔

پھر بھی ایک خوف ہے جو دامنگیر ہے وہ خوف یہ کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری صاف گوئی ہم کو نقصان پہونچائے۔ اور ہماری گفتگو ہم کو مشکوک کر دے۔ کیونکہ زمانہ بدل چکا ہے بالکل نیا ماحول ہے اس گھر میں ہماری زندگی بسر کی زندگی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کیا یہ گھر ہمارا گھر نہیں؟ کیا اس کے مالک ہونے کا شرف ہم کو حاصل نہیں۔ ہاں بات تو کچھ ایسی ہی ہے مگر آج اس سے تھوڑے عرصہ کے لئے انکار کرنا پڑے گا انکار کے اسباب سے بحث نہیں یہ یقین رکھئے کہ ایک زمانہ تھا جب ہم اس گھر کے مالک تھے۔ اور مالک ہونے کا دعویٰ بھی کرتے تھے اور دعوے میں سچے بھی تھے۔

کیونکہ ہم سے قبل اس گھر میں یہ رونق تھی اور نہ اس گھر کے رہنے والے خوشحال اور فارغ البال تھے۔

یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ یہ گھر کوئی نیا گھر نہیں اس کی بنیادیں بہت پرانی ہیں اور نہیں معلوم کون کون اس میں رہ چکا ہے۔ البتہ مکان کی تاریخ بتلاتی ہے اس کے در و دیوار اور کچھ پرانے نقش و نگار پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ یہ مکان ہمیشہ ایک فرد کی ملکیت میں نہیں رہا ہے۔

آرین نسلیں بھی یہاں پھولی پھلی ہیں بودھسٹ بھی اس کے مالک رہے ہیں اور شنکراچارج نے اس کی رونق کو خاک میں ملایا ہے مگر پھر بھی مکان کو اپنا ہی مکان سمجھا۔ جب ہم نے اس طرف کا رخ کیا تو ان پرانے نقش و نگار کو چھوڑ کر اس مکان کو کھنڈر پایا ضرورت محسوس ہوئی کہ مکان تعمیر کیا جائے۔ مگر ان پرانے نقش و نگار کو اپنی اصلی حالت پر بطور یادگار کے باقی رکھا جائے۔

ہمارا اس مکان میں داخلہ اوروں کی طرح کا نہ تھا۔ ہمارا مقصد مکان کو اپنانا اور اس کو اپنا گھر سمجھکر رہنا اور اس کی ظاہری اور باطنی خرابیوں کو دور کرنا اور اس کو ایسا معیاری مکان بنانا کہ جس کو دیکھکر وہ لوگ جو ہماری آمد سے قبل اس کو اپنا مکان کہتے تھے مگر اس کی بنیادیں کھوکھلی کیا کرتے تھے۔ ان کی نگاہیں شرم و ندامت سے جھک جائیں اور یہ احساس پیدا ہو جائے کہ اس کے بنانیوالے جو مقام اس مکان کو عطا کرنا چاہا تھا وہ مقام اس نے آج حاصل کیا ہے اور آج یہ مکان مکان کہلانے کا مستحق ہے اسی نظریے کے ماتحت اس کی تعمیر شروع کی گئی۔

ہاں پہلے معماروں میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، شیخ یحیٰی منیری۔ شیخ شرف الدین بہاری اور اسی قسم کے دیگر نفوس قدسیہ تھیں۔ انھوں نے اپنی مہارت کا ثبوت دیا اور اپنے عمل سے ثابت کیا کہ ہماری آمد اوروں کی آمد کی طرح نہیں ہم آئے ہیں مگر تہیدست نہیں بلکہ ہمارے ساتھ ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہماری معاشرت ہمارا کلچر ہماری زبان اور ہمارا زندگی بخش اعلےٰ معیار ہے۔

اور انھیں چیزوں سے اس مکان کو آراستہ و پیراستہ کرنا ہے۔
کام شروع ہو گیا۔ تعمیر جدید کا آغاز ہوا معماروں کی ضرورت پیش آئی کچھ تو باہر سے بلائے گئے اور زیادہ تعداد یہیں سے مہیا کی گئی۔ البتہ ان کو فن تعمیر کا درس دیا گیا۔ ان معماروں نے اس مکان کو دوبارہ تعمیر کیا۔ وہی تعمیر شدہ مکان آج ہندوستان کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

ہم نے اس کو ہندوستان کہا ہم سے پہلے نہیں معلوم اس کا کیا نام تھا۔ ہمارے ہی قدوم تھے کہ اس میں چار چاند لگنے شروع ہو گئے اور دنیا اس کو جنت نشان سمجھنے لگی۔

ہم نے سب سے پہلے اس کی خرابیوں کو دور کیا کنکر و پتھر جو منتشر تھے جن کو کوئی طاقت مجتمع نہیں کر سکتی تھی ان کو ایک جگہ جمع کیا۔ عمارت کی شکل دی۔ ایک نام رکھا ایک قوم کی لڑی میں منسلک کیا اور ان کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ فخر کے ساتھ کہہ سکیں کہ ہم سب ایک ہیں۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ جب ہم یہاں آئے تو نہیں معلوم کون کون سی انمول اور بیش قیمت چیزیں اپنے ساتھ لائے اسی میں ہماری زبان بھی تھی۔ مگر چونکہ اس مکان کو اپنا نا تھا اور اس کی ظاہری و باطنی زیب و زینت سے مکان کی رونق میں چار چاند لگانا تھا اس لیے ہم نے یہاں کے تمدن یہاں کی معاشرت یہاں کی تہذیب کو ایک خاص انداز میں اپنانا شروع کیا اور ایک ایسی محبت کی داغ بیل ڈالی کہ جو دوری کا ایک پردہ حائل تھا یگانگت کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ مگر ہماری زبان پھر بھی ہماری زبان تھی۔ یہ اور بات تھی کہ یہ دوسروں

کے لئے مشکلات کا باعث بنی ہوئی تھی۔ آخر کار ایک زبان پیدا ہوئی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ پیدا ہوئی ہم نے نہیں پیدا کی بلکہ خود بخود پیدا ہوئی ہم نے اپنی زبان چھوڑ کر اس کو قبول کیا، اپنایا اور ایسا اپنایا کہ اپنی زبان کھو بیٹھے اور صرف اس لئے اپنایا کہ یہ مکان ہمارا مکان تھا۔ ہمیں یہاں رہنا تھا اور یہاں رہنے کے لیے ضرورت تھی کہ ایثار سے کام لیا جائے اور جو زبان یہاں پیدا ہوئی ہے اس کو قبول کیا جائے۔

یہ زبان ہندوستان کی پہلی زبان ہے جو اپنے اصول و قواعد کے اعتبار سے زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اسی کو یہ عالمگیر فوقیت حاصل ہے کہ اس کا جاننے والا ملک کے ہر گوشے میں اپنا کام نکال سکتا ہے اور ضروریات زندگی میں ہر مقام پر اس سے مدد حاصل کر سکتا ہے۔

ہم نے پہلے ہی دن اس کو سمجھ لیا تھا اس لئے بلا تکلف قبول بھی کر لیا تھا اور ہم یہ بھی جانتے تھے کہ آنے والی قومیں ہم سے قریب تر ہوں گی اور دوسرے کو سمجھنے بوجھنے کا موقع ملے گا۔

ہاں یہ بات آپ نہ بھولے ہوں گے کہ زبان ہم نے نہیں پیدا کی۔ بلکہ پیدا ہوئی اور ہم نے قبول کی اور اس طرح قبول کیا کہ اپنی زبان کھلا بیٹھے اور اس زبان میں چار چاند لگا سکے بجری، خسرو، میر، مومن غالب، امیر، اکبر، اصغر، اقبال جیسے باکمال پیدا کئے اور ایک ایسا بھی انسان پیدا کیا جو ہندوستان میں آپ اپنی نظیر ہے اس کو ابو الکلام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے پھر بھی دیا شنکر نسیم رتن ناتھ سرشار چکبست

کیفی۔ مہندر سنگھ بیدی۔ وحشی۔ سحر۔ امن۔ فراق۔ انند نرائن۔ تیج بہادر سپرو۔ پریم چند جیسے انسان نہ پیدا کر سکے۔

یہ بھی بے شک ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ محمد حسین آزاد۔ حالی، علامہ شبلی۔ ڈپٹی نذیر احمد اور شرر اپنے رنگ کے یکتا ہیں مگر جو بات سرشار اور چکبست میں تھی وہ بات کہاں آج کی دنیا کو لے لیجئے۔ یہ دور افسانوی دنیا کا دور ہے تعلیم یافتہ نوجوان کا رجحان طبع افسانوں کی طرف ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ نیلا ٹکس کے قبضے میں ہے اور میدان کا شہسوار کون ہے تو کیا اس حقیقت سے کیا انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ میدان کرشن چند۔ اپندر ناتھ۔ بیدی۔ کیلاش ناتھ کول۔ کنہیالال کپور۔ کشمیری لال ذاکر۔ گلاب رائے۔ برج موہن دتاتریا کیفی۔ بلونت سنگھ۔ عرش ملسیانی وغیرہ کے ہاتھ میں ہے۔

یہ کون ہے ان کے مقابلے میں نہ احمد ندیم قاسمی کو پیش کیا جا سکتا ہے نہ سعادت حسن منٹو کو نہ بڑا احمد۔ ابراہیم جلیس یقیناً بہت اچھے لکھنے والے ہیں مگر کرشن چندر کے پاس جو قلم ہے وہ کسی اور کے پاس کہاں کنہیا لال کپور اپنے رنگ کا یکتا مزاح نگار ہے۔ رام منوہر ردا کی بات ہی دوسری ہے ہاں ہم نے بھی ایک کام کیا ہے اور وہ کام تاریخ میں ایک ایسا مقام حاصل کر چکا ہے جو اپنی آپ نظیر ہے۔

جب ہم شروع شروع یہاں آئے تھے تو یہاں ایک عجیب قسم کی زبان بولی جاتی تھی جس کے نہ قواعد تھے نہ اصول پھر ہر جگہ کے محاورات الگ الگ اور ہر جگہ کے انداز تکلم میں اختلاف قدامت کے اعتبار سے آج دعوے یہ ہے کہ یہ زبان یہاں کی قدیم زبان ہے۔ پتہ نہیں

کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

ہم تو اس کو قدیم زبان نہیں کہہ سکتے کیونکہ نہ اس میں قدامت کی جھلک پائی جاتی ہے اور نہ اس زبان میں لٹریچر ملتا ہے ہاں بھاگوت گیتا ایک بلند پایہ اخلاقی کتاب ہے۔ مگر وہ زبان یہ زبان نہیں رامائن ضرور ایک قدیم کتاب ہے۔ مگر اس کی تدوین اس وقت ہوئی جب ایک نئی زبان کی داغ بیل ہندوستان میں پڑ چکی تھی اور اس کے بعض محاورات تو ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دوسری زبان سے متاثر ہو کر ایجاد کئے گئے ہیں یا ان کا اصل ماخذ دوسری زبان کے الفاظ ہیں۔

بات یہ نہیں کہنی تھی کہہ تو یہ رہا تھا کہ ہم نے بھی ایک کام کیا ہے اور ایسا کام جو اپنی آپ نظیر ہے کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو بھی بتلا ہی دیا جائے؟ تو سنیئے ہم نے نظر دوڑائی ایک مردہ زبان کس مپرسی کے عالم میں نظر پڑی ہاں اس میں رس تھا ضرورت تھی کہ اس کو اٹھایا جائے اور یہاں کے رہنے والوں کو بتلایا جائے کہ یہ گوہر گراں مایہ جس کو کنکر پتھر سمجھ کر پھینک رکھا ہے۔ اگر اس کو اٹھا کر سان پر چڑھایا جائے اور پہل دے کر جلا کی جائے تو بیش قیمت اور انمول جواہر ثابت ہو سکتا ہے یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر کار کچھ جوہری بغیر کسی ترغیب و تحریص کے آگے بڑھے اور ان کنکر پتھر کو جمع کر کے تراشنا اور جلا دینی شروع کی۔

اگر ہمارے مکان پر غاصبانہ قبضہ نہ ہو گیا ہوتا اور ہمیں اس مکان میں مالک مکان کی حیثیت سے رہنے دیا جاتا تو شاید یہ کنکر پتھر جواہرات

کے مول بکتے اور یہاں کا ہر باشندہ اس کو اپنے تاج میں جگہ دیتا۔
یہ بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے مکان پر زبردستی قبضہ کرنے والے نے یہاں کے ان باشندوں کو اکسانا شروع کیا۔ کہ جس کے ہاتھوں اس مکان کی مٹی پلید ہو چکی تھی۔ اور یہ تباہ ہونے کے قریب تھا ان سے کہا کہ یہ کنکر و پتھر حقیقت میں جو اہرات ہیں یہ تو بتغیر شکل تبدیل کئے ہوئے جواہرات کے مول بک سکتے ہیں۔ انہوں نے یقین کر لیا اور اعلان کرنا شروع کر دیا کہ ہم جس چیز کے پیدا کرنے والے ہیں۔ وہ چیز ہماری پیدا کی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری اصل چیز تو وہ ہے جس کو آج کنکر و پتھر کے نام سے پکارا جاتا ہے۔
یہ ہے وہ تکلیف وہ حقیقت کہ جس کے بعد پتھر جوہریوں نے اپنا ہاتھ روک لیا اور زبان حالی سے تو نہیں زبان حال سے کہنا شروع کر دیا کہ یہ احسان فراموشی نہیں تو اور کیا ہے۔
ہندوستان کی سرزمین اور اس مکان کے قدیم مالک کہنا تبھی، دارا شکوہ۔ ملک محمد جائسی۔ عبدالرحیم خان خاناں۔ کبیر اور حضرت امیر خسرو جیسے صاحب کمال پیدا کر چکے ہیں کہنا پڑے گا۔ اور ایمانداری سے کہنا پڑے گا کہ یہ شخصیتیں اپنی آپ نظیر تھیں اور جو کام ان لوگوں نے انجام دیا وہ دوسرا انہیں انجام دے سکتا تھا۔ کنکر و پتھر کو ہیرے کی قیمت میں انھیں لوگوں نے فروخت کیا۔ تنگ نظری کو اگر دخل نہ ہوتا۔ آزاد فضا میں آزادی کے ساتھ کام کرنے کا موقع دیا جاتا۔ تو پھر دنیا دیکھتی کہ اب تک کتنے خسرو کتنے جائسی اور کتنے خان خاناں پیدا ہو چکے ہوتے اور وہ زبان جو قدامت کا دعویٰ کرنے کے بعد آج ہزاروں قسم کے

نقائص سے بھری ہے جس کی نہ کوئی تاریخ ہے اور نہ کوئی اصول و قواعد اس زبان کی راہ میں آجتک بے راہ روی ہے۔ پھر بھی مصائب کو دور کرنے کی طرف کسی کی نظر نہیں اٹھتی۔ اور نہ کوئی توجہ دیتا ہے جس کے مقابلے میں وہ زبان جو یہاں پیدا ہوئی۔ اور جس کو ہم نے قبول کیا جو قدیم بھی نہیں ہے جس میں ہزاروں نقائص بھی ہونا چاہئیں۔ وہ اصول بھی رکھتی ہے اور قواعد بھی اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ایک مدون تاریخ بھی ہے اور پھر ہر شعبے کی الگ الگ تاریخ ہے چاہے وہ نثر ہو یا نظم۔ افسانہ ہو یا ڈرامہ۔ ناول ہو یا افسانہ مضامین مزاح ہو یا کوئی اور شعبہ یہ خصوصیت اس زبان کو آج تک حاصل نہ ہو سکی۔ جو قدیم کی دعویدار ہے پھر تاریخ لکھنے والا ہم میں سے نہیں۔ بلکہ مکان کا قدیم باشندہ اور یہاں کی ساتھ تہذیب و تمدن کا مالک مسٹر سکسینہ ہے۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ کیا کہہ رہا تھا کیا کہنے لگا۔ آپ بھی کہتے ہوں گے کہ اس خشک بیانی سے کیا فائدہ آخر کہنا کیا چاہتے ہو تو بات یہ کہہ رہا تھا کہ بھائی ہم نے ایک زبان قبول کی اور اپنی زبان چھوڑ کر قبول کی۔ مگر خوشی سے قبول کی اور ساتھ ہی ساتھ ایک مردہ زبان کو زندگی بخشنے کی کوشش کی۔ ابھی وہ زبان باقاعدہ زندگی حاصل بھی نہیں کر سکی ہے پھر بھی کہا یہ جا رہا ہے کہ وہ زندہ زبان ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں اس کو اپنانا پڑے گا۔ اور جو زبان یہاں پیدا ہوئی ہے جس کے بنانے والے وہ خود ہیں آج جبکہ وہ زبان اتنی ترقی حاصل کر چکی ہے کہ اس کو عالمگیر زبان کہا جا سکتا ہے۔

اور جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ کہ بحیثیت زبان کے اس نے وہ مقام حاصل کر لیا ہے کہ جو مقام انگریزی کا ہے۔ اس زبان کا جاننے والا دنیا کے ہر گوشے میں جبکہ اپنا کام آسانی سے نکال سکتا ہے۔ بجا ہے اس اعلان کے آج کہا یہ جا رہا ہے کہ بات صحیح ہے۔ "ناہموار زمین کو ہموار ہم نے بنایا۔ بیج ہم نے بویا آب پاشی ہم نے کی۔ پودا ہم نے لگایا اور ہماری ہی محنتوں سے بڑھا پھلا پھولا۔ پھول میں خوشبو بھی ہے درخت کے سایہ دار ہونے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ پھل کا ذائقہ بھی ایسا ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی نمائش گاہ میں اس کو رکھا جا سکتا ہے۔ اور اس کے ذائقے کی بدولت جس قدر انعامات ہو سکتے ہیں وہ حاصل کئے جا سکتے ہیں لطافت میں تو کوئی زبان مقابلہ ہی نہیں کر سکتی۔ لیکن ان تمام اقراروں کے بعد آخری بات جو کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ بہار تو ہماری لائی ہوئی ہے خزاں کا دور بھی ہمارے ہی ہاتھوں آتا جا رہا ہے۔"

اچھا تو لاؤ اور خزاں کو لاؤ مگر ایک بار اس مکان کی تاریخ کو دہرا جاؤ۔ پھر بتلاؤ یہ مکان پہلے کیسا تھا؟ کس نے ترقی دی؟ کس نے چار چاند لگائے؟ کس نے کھنڈر بنایا؟ پھر کس نے رونق بخشی، یہی کیفیت آج زبان کے باب میں ہے۔

پیدا کرنے والا کون؟ ترقی دینے والا کون بہاروں سے فائدہ اٹھانے والا کون، خزاں کا دور لانے والا کون۔ ہر موقع پہ ہر مقام پہ جب نظر ڈالو گے تو ایک ہاتھ نظر آئے گا۔

آنے دو خزاں کو آنے دو تمہیں کس بات کی فکر ہے پھر بہار

آسکے گی اور انھیں ہاتھوں سے آسکے گی۔ یا جو ہاتھ اس مکان کی تعمیر میں لگ چکے ہیں اور جس نے غاصبانہ قبضے سے قبل رونق بخشی تھی۔

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس زبان کو مٹ جانے دیں۔ اور جو اس کی بنیادیں اکھیڑ کر پھینک دینا چاہتے ہیں ان کا ہاتھ بٹائیں یہ کوئی عقل مند مشورہ نہیں دے سکتا۔ پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بدلے جو زبان عاید کی جا رہی ہے اس کو قبول کریں یا نہ کریں تو میں کیا مشورہ دوں۔ مگر ان سے ضرور یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو زبان زبردستی اس مکان کے رہنے والوں پر بطور بوجھ کے لادنا چاہتے ہیں وہ اپنی جگہ اس بات کو ضرور سمجھ لیں کہ اس سے بجائے زبان کی خدمت کے اور بھی نقصان پہونچے گا۔

یہ صحیح ہے کہ کلرک مل جائیں گے مگر ناقص وہ ورنہ ہو سکیں گے اچھا تو پڑھنا جائے گا۔ معائب سے یہ زبان آلودہ ہوتی جائے گی۔ نہ کوئی خسرو پیدا ہوگا نہ ولی۔ ملک محمد جائسی اور رحمان خاناں کا تذکرہ بیکار رہے گا۔

ہاں اگر آزاد چھوڑ دیا گیا اور زبان سے کچھ نہ کہا گیا۔ تو ایک دن یقیناً یہ زبان معیاری زبان ہوگی۔ اور اسی زبان کو زبان کہا جا سکیگا مگر یہ سب اپنے عمل پر موقوف ہے۔

تنگ نظری سے منہ موڑا جائے۔ ہر باشندے کو زبان کے معاملے میں آزاد چھوڑ دیا جائے اس میں وہ مردہ زبان زندہ ہو سکتی ہے اور اس کے اصول و قواعد بھی مرتب ہو سکتے ہیں اور اسی کی روشنی میں اس کے شاندار مستقبل کی ایک تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے جو اپنی نظیر آپ ہوگی رہا ماضی کا معاملہ تو اس کو ابوالفضل فیضی۔ دارا شکوہ اور حضرت

امیر خسرو سے جوڑا جا سکتا ہے۔

یہ ایک مختصر سی بات تھی جو بات ہی کے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ مقصود اصلی کسی نئی بحث کا آغاز نہ تھا۔ بلکہ ایک قدیم چیز کو نئے انداز میں پیش کرنا تھا جو اختصار کے ساتھ پیش کر چکا محاسن معائب آپ کے سامنے ہیں ان پر نظر رکھتے ہوئے معائب کو نظر انداز فرما کر محاسن کو قبولیت کا جامہ عطا فرما کر مشکور فرمائیں ؛

ہندی۔ اردو۔ ہندوستانی

(از مؤلف)

وطن پروری اور آزادی کے نشہ میں سرشار ملک جلسوں میں قوم کے لیڈر اور ہندو مسلم اتحاد کے سرتاج لیکن خلوت میں قومیت کے خلاف زہر اگلنے اور اتحاد و ترقی کی مستحکم بنیادوں کو مسمار کرنے والوں نے جہاں ہندوستان کے طول و عرض میں بہت کچھ کام دکھائے وہاں انہوں نے زبان اردو کے خلاف بھی زہر افشانیاں شروع کر دیں اردو جس کو ہندو مسلم اتحاد پر ناز تھا سے

یادگار اتحادِ اہلِ اسلام و ہنود
کارگاہ ہند سے منسوب جس کا تار و پود

دانستہ طور پر نظر انداز کی جانے لگی۔ ہر جگہ اس کے خلاف صف آرائیاں شروع ہو گئیں۔ اس نے زبانِ حال سے پکار پکار کر کہا کہ اس سر سبز و

شاداب چمن کی خوش رنگ کیاریوں کو تعصب کی کلہاڑی سے مسمار مت کرو۔ لیکن دشمنانِ امن و اتحاد کے کانوں پر پردے پڑے رہے۔ ہر جگہ مادرِ وطن کی زبان کو کاٹنے کے لئے مختلف شکلوں میں چھری تیز ہونے لگی۔ کہیں اس کو اسکول و کالج سے نکالا جانے لگا۔ کہیں عدالت کے ان دروازوں پہ جہاں اس کے لئے ہر وقت بلا روک ٹوک آنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ بلکہ یہ وہاں پر پورے طور پہ قابض تھی۔ "بلا اجازت اندر آنا منع ہے" کی تختی لگا دی گئی۔ کہیں میونسپل دفتروں میں دور ہٹو کے نعرے سے اس کا خیر مقدم کیا جانے لگا۔ آئے دن اس کے ساتھ طرح طرح کی ستم ظریفیاں ہونے لگیں۔ اس نے اپنے قومی اور مادری زبان ہونے کے بیشتر ثبوت کئے۔ اپنے دربار کے ہندوستانی رشتوں کا واسطہ دیا لیکن اس کے سپوتوں نے بغاوت کی ٹھان لی تھی۔ انہوں نے ایک بھی نہ سنی۔ یہ سب کچھ ہوتا رہا۔ اور پھر کیوں نہ ہوتا۔ وفاداروں نے بھی غفلت سے کام لیا۔ اور اس کی تائید کے جوش میں اس کو ایک فرقہ یا جماعت کی میراث بتلانے لگے۔ برادرانِ وطن کے چند ادارے جو پہلے ہی سے اس کے درپے آزار تھے اب کھلم کھلا سامنے آنے لگے۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسی کے ساتھ ہی ساتھ ہماری قومی اور جمہوری حکومت نے بھی زبان اردو کے ساتھ چند مہینوں میں جو سلوک کیا وہ ایک غیر ملکی حکومت چند صدیوں میں بھی نہ کر سکی تھی۔

ایک طرف تو کانگریس بلا اختلاف مذہب و ملت ہندوستان کے

تمام فرقوں کی نمائندگی ان کے کلچر کے تحفظ اور متحدہ قومیت کی مدعی
ہے۔ دوسری طرف اور چیزوں کے ساتھ ساتھ زبان اردو کے ساتھ
جو ہندوستان کے میل ملاپ کی پیداوار ان کے اتحاد کی نشانی اور
دونوں کے مشترک کلچر کا سب سے بڑا نمونہ اور اس کی امین و محافظ
ہے۔ کانگریس حکومت کا یہ طرزِ عمل نہایت حیرت انگیز ہے معلوم
نہیں کیوں مہاتما گاندھی کے زریں اصولوں پر آزاد ہندوستان کے
تعمیر کی قسمیں کھانے والے آج بہار کی جگہ خزاں لا رہے ہیں۔

آج جبکہ ہمارے سامنے یہ صورت حال ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں
کہ مہاتما گاندھی سے کئے ہوتے تمام عہد توڑے جا رہے ہیں تو پھر ہم
بھی کیوں نہ صاف صاف حقیقت کو پیش کر دیں۔ گاندھی جی نے
ہندوستانی زبان اور اس کے لئے ناگری اور اردو رسم الخط کے
لئے جو اس قدر کوشش فرما رہے تھے یہ ہندی کے لئے تو یقیناً ایک
بہترین چیز تھی لیکن اردو کے ساتھ کھلی ہوئی عداوت اور دشمنی تھی۔
مجھے ناگری رسم الخط سے کوئی دشمنی نہیں لیکن پھر بھی میں یقین کرتا
ہوں کہ ناگری رسم الخط ایک نامکمل اور تکلیف دہ رسم الخط ہے میرے
خیال میں زبان اور رسم الخط کی جو تحریک گاندھی جی نے اٹھائی تھی
اس کی بنیاد ہی غلط تھی۔ کیونکہ زبان ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہیں
ہوا کرتی۔ بلکہ کسی دیس یا ملک کی ہوا کرتی ہے۔ آپ نے کبھی نہ سنا
کہ عراق کے مسلمان عربی اور عیسائی عبرانی یا کلدانی زبان بولتے ہیں
اور نہ آپ کے تصور میں یہ بات آ سکتی ہے کہ بنارس کے مسلمان عربی
اور ہندو سنسکرت زبان بولتے ہوں گے کیونکہ ایسا ہونا عقل کے خلاف

اور فطرت انسانی کے اقتضا کے بالکل منافی ہے۔

ہر ملک کی زبان وہ ہوتی ہے جس میں اس ملک کے رہنے والے چاہے وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں بات چیت کیا کرتے ہیں وہی زبان ان کے لکھنے پڑھنے اور تمام ضروریات میں استعمال کی جاتی ہے۔ پھر یہ کہنا صاف جھوٹ اور کتنی غیر حقیقی بات ہے کہ اردو مسلمانوں کی اور بھاشا ہندوؤں کی زبان ہے۔ کیا آج جو زبان ہندی کے رسالوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ وہ ہندوستان کے کسی حصے میں تلسی داس کی رامائن والی یا خانخاناں کے دوہوں والی زبان بولی جاتی ہے۔ کیا آج جو زبان ہندی کے رسالوں میں استعمال کی جاتی ہے وہ ہندوستان کے کسی حصے بلکہ کسی ایک گھرانے میں کہیں بھی بولی جاتی ہے۔ صدیاں گذر گئیں کہ وہ زبان ہندوستان سے رخصت ہو گئی۔ بالکل اسی طرح جیسے سرکاری دفاتر سے فارسی ختم ہو گئی۔ اب جو زبان ہندوستان میں رائج ہے اس کے لئے کسی تشریح کی ضرورت نہیں سب جانتے ہیں کہ وہ وہی زبان ہے۔ جو ہندوستان کے تمام شہروں اور دیہاتوں میں عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ کلکتہ، بمبئی، یو۔پی، بہار پنجاب، ناگپور جہاں جی چاہے بول کر پوچھکر دیکھ لیجیئے۔ آپ کو معلوم ہو جائیگا۔ کہ ایک ہی زبان رائج ہے۔ صرف لب ولہجہ کا معمولی سا فرق تو پایا جائے گا۔ مگر زبان میں کوئی بنیادی فرق نہ ہوگا۔

ان علاقوں میں جہاں اردو یا ہندوستانی زبان بولی جاتی ہے آپ جانتے ہیں کہ ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی، بدھ اور لامذہب سب ہی بستے ہیں لیکن سب کی الگ الگ زبانیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی

زبان ہے جس سے سب اپنے دل کی دوسرے کو سناتے اور دوسرے کی کہی خود سنتے ہیں اگر ایسا نہ ہو تو شاید آقا اور نوکر باپ اور بیٹے اور دو پڑوسیوں میں کبھی تبادلۂ خیالات ممکن نہ ہو۔

ہاں اگر مردہ زبان سنسکرت یا مردہ بھاشا کو ہندوستان زندہ کرکے تاریخ کا سب سے پہلا تجربہ کرنا ہے اور آہستہ آہستہ ہندوستان کی روزمرہ کی زبان کو سنسکرت زبان بنانا چاہتے ہیں جو کبھی کسی زمانے میں روزمرہ کی زبان نہ تھی تو ایک الگ مسئلہ ہے جس پر کسی اور فرصت میں کچھ عرض کروں گا۔ لیکن اگر اسی زبان کو زندہ رہنا ہے جسے ہم آپ سب بولتے ہیں اور جسے آج ہندی، ہندوستانی کے مہمل مرکب سے یاد فرمایا جاتا ہے تو یقین فرمایئے۔ اس کے لئے ناگری رسم الخط کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ क پر نقطہ لگا کر क़ اور ग پر نقطہ لگا کر ग़ تو بنا لیا جا سکتا ہے مگر "ڑ" کی آواز اور ن، ھ، ل۔ ھ کی مرکب آوازوں کے لئے کیا سبیل نکالی جائے گی۔

اگر زندہ رہنا ہے اور زندوں کی طرح اپنی زبان و قلم سے کچھ کام لینا ہے تو ٹھنڈے دل سے بغیر ضد اور غصے کے جذبات کی آمیزش کے سوچئے اور غور فرمایئے ہٹ اور تنگ ظرفی سے تعصب اور کینے سے بلند و بالا ہو کر سوچئے اور غور فرمایئے کہ اس قسم کی تحریکوں اور کوششوں سوائے نقصان کے اور کیا حاصل ہے۔

اردو اور ناگری دونوں خطوں پر مختلف حیثیتوں سے غور فرمایئے تفصیل بڑی فرصت اور وسعت چاہتی ہے اس لئے صرف بعض حیثیتوں اور وہ بھی بہت غیر تفصیلی طور پر اس صحبت میں عرض کرتا ہوں۔

سب سے پہلے نقوش اور آوازوں کی مطابقت کو لیجیے اور ناگری رسم الخط کو لیجیے۔ یہ رسم الخط باوجود ترمیم و اضافے کے ہماری زبان کی تمام آوازوں کو ادا نہیں کر سکتا۔

ناگری میں ۴۷ حروف صحیح (ویکین) ۱۶ حروف علت (سور) اور ۱۶ ماترائیں یہ کل ۶۹ ہوتے ان پر ۵ ان حروف کا اضافہ کیجیے۔ جو خ، غ، ز، ف، ق کی آوازوں کے لئے نقطے لگا کر بنائے گئے ہیں۔ کل (۷۴) حروف تہجی ہوئے اس اتنے بڑے مجموعے میں ل ہ اور ن ہ کی مرکب آواز کے لیے کونسی ترکیب ہے؟ مثلاً ننھا اور لفظ کولھو میں ل کے ساتھ ہ کی اور ن کے ساتھ ہ کی مرکب آواز پیدا ہوتی ہے ناگری میں باوجود اس قدر کثیر حروف تہجی کے اس کے لئے کوئی سامان نہیں ہے۔ آجکل جس طرح لکھتے ہیں وہ چند ویدی دوارکا پرشاد شرما کی ڈکشنری ہندی شبدارتھ پاریجات سے نقل کرتا ہوں۔

کولھو [illegible] اور ننھا [illegible] لیکن ان سے جو آواز پیدا ہونا چاہیے وہ کو ل ہو اور ن ہا سے مرکب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اسی لغت میں [illegible] سنہری اور [illegible] [illegible] کے لئے وہی ٹکڑے استعمال کئے گئے ہیں۔ اصل میں ناگری حروف کے ٹکڑے صرف ان حروف کے ساکن ہونے کو بتاتے ہیں، مرکب آوازوں کے لئے الگ الگ حروف ہوتے ہیں جیسے [illegible] گھ [illegible] وغیرہ مگر لام اور ن کی اس طرح دو سے مرکب آواز کے لئے کوئی حروف موجود نہیں ہے۔

اسی طرح دکھاؤ۔ بلاؤ یعنی اردو میں جو آواز ہمزہ اور واؤ سے ادا کی جاتی ہے اس کے لئے ناگری میں کوئی نقش موجود نہیں۔

ہمزہ اور واؤ سے جو آواز پیدا ہوتی ہے وہ یقیناً الف اور واؤ کے مرکب سے مختلف ہے لیکن ناگری رسم الخط میں کوئی سبیل اس کے ادا کرنے کی موجود نہیں۔ بلا او۔ یا دکھا او۔ لکھنا پڑے گا۔

س۔ ص۔ ث کی آوازیں اردو میں اگرچہ مختلف نہیں ہیں۔ مگر ان میں معانی کے اعتبار سے بڑا فرق ہے اگر اس فرق کو ختم کر کے ناگری حرف स سے کام لیا گیا تو ہم اثیر اور اسیر کے باہمی فرق سے محروم ہو جائیں گے۔ یہ کسی زبان کا عیب نہیں ہے بلکہ یہ خوبی ہے۔

ان آوازوں کے علاوہ اور بہت سی بے شمار آوازیں ہیں جو ادا نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ دوسرے ہر اس شخص کو معلوم ہو سکتی ہیں جو دونوں رسم الخط سے واقف ہیں۔ ناگری رسم الخط پر اس حیثیت سے بھی غور کرنے کی ضرورت ہے میں نے اپنے بعض احباب سے جو ناگری رسم الخط سے ناواقف ہیں بارہا سنا ہے کہ ناگری دو دن میں سیکھی جا سکتی ہے لیکن ان کا یہ فرمانا بطور واقعہ نہیں بلکہ محض لطیفہ کی طرح ہوتا ہے ان میں سے بعض نے مہینوں محنت کی لیکن لکھنے پڑھنے پر قادر نہ ہو سکے۔ اس وقت انھیں معلوم ہوا کہ وہ جو سمجھ رہے تھے وہ ناواقفیت اور غلط فہمی تھی۔ ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ میرے ایک دوست کے ساتھ بھی یہی قصہ ہوا اور ان کو تقریباً تین ماہ تک محنت کرنے کے بعد یہ اقرار کرنا پڑا کہ ناگری خط سیکھنے کے بارے میں وہ غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ دراصل ناگری اردو سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ ایک صاحب نے اردو کے لئے لاطینی رسم الخط تجویز کرتے ہوئے اپنی دانست میں بڑا سخت اعتراض اردو

رسم الخط پر کیا تھا کہ وہ اب تک کبھی کبھی "س" کی جگہ "ص" لکھ دیا کرتے ہیں میں نہیں سمجھ سکا کہ یہ اعتراض اردو رسم الخط پر عاید ہوتا ہے یا ان کے علم و فضل پر۔ ان حضرت کو شاید یاد نہ رہا کہ ابتدائے تعلیم میں انہوں نے انگریزی الفاظ کا املا کتنی بار غلط لکھا تھا۔ اور آج کتنی بار ڈکشنری کی مدد لئے بغیر ان کو صحیح املا لکھنا نصیب ہوتا ہے افسوس کہ شاید وہ بیچارے ناگری سے حرف شناس نہیں ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ ناگری میں اردو سے زیادہ پابندی کے ساتھ र ، ब ، शा ، न کا فرق قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اور جب تک صحیح املا معلوم نہ ہو کوئی شخص صحیح عبارت نہیں لکھ سکتا۔ اور لکھنا تو الگ رہا ایک سطر پڑھ بھی نہیں سکتا۔ اگر خدا نخواستہ اس میں مبالغہ معلوم ہوتا ہو تو ناگری حروف صحیح (۳۷) علامت ۱۴، ماترا ۱۲ اور پانچ خ غ وغیرہ والے منقوط حروف کل ۶۳ جو ناگری کے پورے حروف ہجا ہیں کسی سے ایک بڑے تختے یا کاغذ پر لکھوا لیجئے۔ پھر ان کی مدد سے کسی ہندی رسالہ کی صرف سرخیاں ہی پڑھنے کی کوشش فرمائیے۔ معلوم ہو جائے گا کہ حرف ترکیب کے وقت اتنی طرح طرح کی شکلیں بدلتے ہیں کہ سینکڑوں جگہ ان کی اصلی شکلوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔ اردو میں قاعدہ ہے کہ کوئی حرف جب کسی حرف سے ملتا ہے تو ملنے والے حرف کا ابتدائی حصہ آخری کشش کو نکال کر قائم رکھا جاتا ہے جو پڑھنے والوں کو اپنی اصلی شکل یاد دلاتے ہیں مثلاً جسم میں "ج" کا اور "س" کا ابتدائی حصہ اور میم کامل موجود ہے۔ لیکن ناگری میں یہ ضروری نہیں ہے۔ صرف "ज" راجیب مرزا मिर्ज़ा میں لکھا جاتے اپنی اصلی شکل اس

طرح بدل دے گا کہ لفظ کے آخری حصّہ پر اوپر کو ایک قوس نما نشان بن جائے گا۔

ملاحظہ فرمایئے کہ صرف ے سے (ے) اس نشان کو کیا نسبت ہے اور جب تک کوئی صحیح املا نہ جانے کیسے پڑھ سکتا ہے اسی طرح کی اور بے شمار دشواریاں بکھری پڑی ہیں۔ معائب اور محاسن آپ کے سامنے ہے آپ خود غور فرما کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دونوں رسم الخط میں سے کون رسم الخط آسانی سے سیکھا جا سکتا ہے۔

دیانتداری سے فیصلہ کرنا چاہیئے دوسرے تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ بچوں کی تربیت بھی ضروری ہے قوموں کی ترقی کے لیے تعلیم سے زیادہ تربیت اہم ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت تک تعلیم مفید نہیں ہو سکتی، جب تک اس کے ساتھ صحیح تربیت اور بااصول تربیت بھی نہ ہو۔

تربیت کا اصلی وقت بچپن ہے اس لئے کہ اس وقت بچہ کا مزاج ایک غیر متشکل مادہ ہوتا ہے جس کا اچھے یا برے قالب میں ڈھالنا مربی کے اختیار میں ہوتا ہے اسلئے جو قومیں زیادہ تر زندہ رہنا چاہتی ہیں، یا اس وقت زندہ ہیں اور آئندہ بھی زندہ رہنا چاہتی ہیں وہ ان معصوم ہستیوں کی تربیت غور و اہتمام اور اعتناء کامل کے ساتھ کرتی ہیں جن کا نام آئندہ چل کر قوم ہوگا۔

صحیح تربیت کیا ہے؟ وہ نظام پرداخت جس میں اخلاق، دماغ، اور جسم تینوں کی پرورش و بالیدگی پیش نظر ہو۔ کیونکہ جس طرح اس کارزار حیات میں زندہ رہنے کے لئے معلومات میں وسعت اور افکار و خیالات میں روشنی کی ضرورت ہے اسی طرح بلکہ اس سے کئی چند زیادہ وسیع النظری

حوصلہ میں بلندی ارادہ میں عزم، نیتوں میں اخلاص، عمل میں ایثار، دل میں شجاعت اور جسم میں صحت و قوت کی بھی ضرورت ہے پس جو نظام ان صفات کے اشخاص پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے وہ صرف ناقص ہیں۔ ایک داخلی خطرہ ہے جو قومی حیات کے لئے تمام خارجی خطرات و اعداء سے کہیں زیادہ مہلک و قاتل ہے۔ کیونکہ ناقص تعلیم و تربیت قومی زندگی کی بنیادیں کھوکھلی کر دیتی ہیں۔ اور جب کسی عمارت کی بنیاد اندر سے کھوکھلی ہو تو انجام اچھا نہیں رہ سکتا۔

آج ہندوستان میں جس قسم کی تعلیم خلاف فطرت دی جائے گی اور جس نظریئے اور تخیل کے بنا پر یہ منصوبہ باندھا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ بالکل برعکس اور اس تعلیم کے ذریعہ کوئی بچہ بھی مفید شہری نہ بن سکیگا۔ کیونکہ ایک غیر مانوس زبان میں اسے تعلیم دی جائے گی۔ خواہ وہ بچہ ہندو ہو یا مسلمان سکھ ہو یا کچھ اور ہر بچے کے لئے یہ زبان غیر مانوس ہو گی۔ اور یہاں ہر بچہ کے ذہن میں یہ چیز پیدا ہو گی۔ کہ یہ تعلیم اسے جبری طریقے پر دی جا رہی ہے یہ حکومت کی زبان ہے۔ اس سے چون و چرا ایک جرم ہے یہاں سے بالکل انگریزی پالیسی کا زہر پروان چڑھے گا۔ دوسری طرف ہندوستان کی یکجہتی اور ایک قوم کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ مہاتما گاندھی کے زندگی کے سارے کارناموں پر خاک پڑ جائے گی۔ بہرحال اگر یہی منشا ہے اور یہی آخری فیصلہ ہے تو نتیجہ پھر اس کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔

ملک کو آزاد ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے ہیں اور ڈیڑھ سو برس سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہمارا ملک بہت سی ایسی لعنتوں میں مبتلا ہو چکا ہے جس کے دفعیہ کی ہم کو سخت ضرورت ہے آج ہمارے

قومی حکومت کا سب سے پہلا فرض تو یہ ہے کہ ملک سے مفلوک الحالی تنگدستی
اور غربت کا خاتمہ ہو جہالت دور ہو تعلیم کا عام رواج ہو تعلیم کسی زبان
میں حکومت کی طرف سے دی جائے یہ ایک ایسا مضحکہ خیز سوال ہے جو
کم سے کم بیسویں صدی کے کسی آزاد ملک میں نہیں ہے عوام جس زبان
میں چاہیں تعلیم حاصل کریں حکومت کا صرف یہ فرض ہے کہ جہاں تک ہو سکے
زائد سے زائد سہولت عوام کو بہم پہنچائی جائے۔ تاکہ انہیں بہت جلد
لکھنا پڑھنا آجائے حکومت کو چاہیئے تھا کہ بڑی دریا دلی اور فراخدلی
سے اعلان کر دیتی کہ عوام کی سہولیت کے لئے گورنمنٹ کی طرف سے
ہر شہر اور قصبات میں ابتدائی مفت اور جبری تعلیم کا انتظام کر لیا گیا
ہے ان اسکولوں اور مدرسوں میں ہندی اور اردو دونوں زبان میں تعلیم
دیجاتی جو جس زبان میں چاہتا تعلیم حاصل کرتا اور دس پندرہ برس تک
اسی طرح کا طریقہ رائج ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا کہ عوام خود بلا کسی جبر و زور
کے اپنے آپس کے تعلقات کی بنیاد پر ایک ایسی زبان کو ترقی دیتے جو
ہندوستان کی صحیح معنوں میں عوام کی زبان ہوتی۔ اور عوام کو اسے
قبول کرنے میں کسی قسم کی پریشانی نہ محسوس ہونے پاتی۔ لیکن جیسا کہ ہم
دیکھ رہے ہیں ایسا نہیں ہوا بلکہ ہوا یہ کہ بہت سے ضروری مسائل کو
بالائے طاق رکھکر ہماری یو۔پی گورنمنٹ نے سب سے پہلے طے کر لیا کہ
صوبہ کی سرکاری زبان ہندی ہوگی۔ اور پانچ برس سے لیکر ۱۲ برس تک
صوبہ کے ہر بچہ کو اسی زبان میں جبری تعلیم دیجائے گی۔ اس پر لاکھوں
روپے صرف کئے جا رہے ہیں اور کوشش کی جا رہی ہے کہ کوئی ایسا منتر
پڑھکر چھیدکر دیا جائے جس سے یک بیک اگر ہم صبح آنکھ کھولیں۔ تو

ہم کو اردو کا نام و نشان نہ ملے ہر جگہ سنسکرت اور ہندی نظر آئے مجھے اس سے انکار نہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ جب ہماری "قومی" حکومت نے بلا خوف و خطر ایسا ارادہ کر لیا ہے تو ضرور ہو کر رہے گا۔ لیکن میں ملک کے ان ذی ہوش افراد سے گذارش کرتا ہوں جنھیں وطن عزیز کا ہر ایک ذرہ بھی پیارا ہے کہ کیوں قومیت کے نام پر یہ سب کچھ کیا جا رہا ہے صاف صاف اعلان کر دیا جائے کہ ہم نے سوا نگریس کے اصولوں کو ٹھکرا دیا۔ مہاتما جی کی باتیں ان کے ساتھ چلی گئیں اب ہم خود مختار ہیں جو چاہیں کریں لیکن حامیان اردو اور اتحاد و ترقی کے حامیوں سے گذارش ہے کہ وہ کم سے کم ان بچوں کا خیال فرمائیں جن کی مادری زبان اردو ہے کیا ان کے لئے اتنا بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہفتہ میں کم سے کم دو یا تین گھنٹہ پڑھائی کے لئے ایسا رکھ دیا جائے جس میں وہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر سکے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو نہ ہو لیکن یہ ضرور کیا جائے کہ کوئی مجنونانہ قدم اٹھانے سے پہلے ارباب حل و عقد سے مشورہ ضرور لے لیا جائے ۔

ہندوستانی زبان اُردو ہے

وہ بھی اس لئے

کہ یہ زبان ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے

— آزاد ہندوستان میں اتحاد ضروری ہے —

ہماری زبان

(جناب محمد فاروق صاحب)

برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۲۸ کروڑ چالیس لاکھ ہے آپ کو معلوم رہنا چاہیئے کہ ان میں تقریبًا ۲۰ کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترک رشتہ کا کام دیتی ہے وہ اردو زبان ہے۔ یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبے کی سرزمین میں بولی جاتی ہے۔ (موسیو دیوپان)

بنگال، بہار اور اڑیسہ کے زمینداروں اور دوسرے باشندوں نے وائسرائے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرضداشت بھیجی جس میں یہ درخواست کی کہ جدید ہائیکورٹ میں کارروائی اردو زبان میں ہونی چاہیئے (گارسن ڈی ٹاسی بحوالہ بمبئی گزٹ ۲۶ فروری ۱۸۹۶ء)

۱۸۹۷ء کا واقعہ ہے کہ ایک سینیا کے سفیر (MOVAAD) سے ایک موقعہ پر کسی خاص معاملہ میں چند استفسارات کئے گئے۔ ان میں سے ایک یہ تھا "فلاں شخص نے آپ کی حضوری میں کس زبان میں گفتگو کی" انہوں نے جواب دیا کہ "ہندوستانی زبان میں جس کی ترجمانی ہز ایکسیلینسی ہائی گورنمنٹ آف بٹاویا کے سیکریٹری نے کی" اسی زمانہ کا ایک سیاح فرائٹر لکھتا ہے "دربار کی زبان تو فارسی ہے مگر عام بول چال کی زبان ہندوستانی ہے"

ہم ان پرانی باتوں کو یہیں چھوڑتے ہیں اور کمپنی کے زمانہ کی طرف

آتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں انگریز ملازموں کی تعلیم کے لئے ملک کی ایک ایسی زبان کو چنا گیا جو اپنی عام مقبولیت اور پھیلاؤ کی وجہ سے بہت کار آمد تھی۔ اور جسے اس وقت ہندوستانی اور اردو کہا جاتا تھا۔ اس کے لئے ایک بڑی درسگاہ قائم کی گئی۔ جو آج بھی فورٹ ولیم کے نام سے مشہور ہے اس کالج کے معلم اول ڈاکٹر جان گلکرسٹ تھے جو اردو زبان کو

grand popular speech of India

کہا کرتے تھے۔ (دیکھو ان کی کتاب برٹش انڈیا مونی ٹر)

(۲)

ڈاکٹر گلکرسٹ صاحب اپنی اسی کتاب میں زبان کی تعلیم کے متعلق حکومت کے احکام کی نقل کر کے جو ان برٹش افسروں کے نام ایک پیغام بھیجتے ہیں جو ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"ہندوستانی زبان کا علم برٹش انڈیا میں نہ صرف ہر ایک ایسے اجنبی کے لئے لازم ہے جو عام طور پر اہل ملک سے ذاتی تعلقات رکھتا ہے بلکہ اس سے فارسی اور دوسری مشرقی زبانوں کی تحصیل کا راستہ بھی کھل جاتا ہے جہاں وہ ہندوستانی زبان کے ذریعہ جو ہندوستان کے باشندوں اور خصوصاً منشیوں یا دیسی سوداگروں کی دیسی زبان ہے ان مقامی قدیم زبانوں کو بہت جلد سیکھ لیتا ہے بحری فوج میں نیز ہندوستان کے خانگی معاملات میں کسی زبان کا ایسا رواج نہیں جیسا ہندوستانی کا۔ اور کیڈٹوں کو جو فوجی اکیڈمیوں میں اسے پڑھتے ہیں یا فوجی تعلیم حاصل کرتے ہیں کسی اور زبان کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ اکیڈمیاں بنگال۔ مدراس اور بمبئی میں قائم کی گئی ہیں"

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں مدراس کے ایک انگریز افسر کا خط بھی نقل کیا ہے جس کا اقتباس ذیل قابلِ ملاحظہ ہے، یہ خط ۱۹ ؍جون سنہ ۱۸۰۳ء کو لکھا گیا ہے:-

"ہندوستانی بولی کے متعلق میرا کچھ کہنا غیر ضروری ہے کیونکہ اس کی وسعت اور قوت ان تمام اشخاص پر کافی طور سے آشکارا ہے جن کا تعلق ہندوستان کے کاروبار یا آپ سے ہے) میری رائے میں صرف اس بولی کا معقول علم اس گورنمنٹ کے علاقوں کے ہر حصہ کے لئے بالکل کافی ہے نواب آف ارکاٹ کے تمام علاقوں اور ٹیپو سلطان کی مملکت بالاگھاٹ میں ہندوستانی سے وہ سب اشخاص آگاہ ہیں جو سرکاری دفاتر میں مامور ہیں نیز عام لوگوں کی بڑی تعداد اس زبان کو جانتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب اپنی ایک اور کتاب "ایسٹ انڈیا گائیڈ" میں لکھتے ہیں "ہندوستانی زبان ایک مشترک ذریعہ ہے جس کے توسط سے اہلِ ملک عموماً اور متعدد غیر ملکوں کے اکثر باشندے جو اس ملک میں بس گئے ہیں۔ اپنی ضرورتوں اور خیالات کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں اس بیان کی صداقت میں ہم خود ایک شہادت ہیں اور ہماری طرح پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی، جرمن، عرب، ترک، یونانی، ارمنی، گرجی، ایرانی، مغل اور چینی بھی ہیں جو اکثر باہم ہندوستانی میں بات چیت کرتے ہیں کیونکہ ان کی اپنی زبانوں کے مقابلہ میں ہندوستان کی یہ لنگوا فرانکا زیادہ سہولت بخش ہے ہندوستان کی تمام فوجوں میں یہ زبان عام طور پر استعمال ہوتی ہے تقریباً راس کماری سے لیکر کابل تک سارا ملک جو طول میں دو ہزار میل اور عرض میں چودہ سو میل ہے اس میں جہاں جہاں گنگا بہتی ہے شاید ہی کسی بڑے گاؤں، قصبہ

یا شہر میں جسے مسلمانوں نے فتح کیا یا جہاں مسلمان آباد ہیں کوئی ایسا شخص ملیگا جو اچھی خاصی طرح ہندوستانی نہ جانتا ہو اور گنگا سے بھی پرے نیز مشرقی جزائر کے سواحل پر بھی یہ زبان رائج ہے اور اس قدر معروف ہے کہ بہت آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے۔"

(۳)

ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب میں اپنے ایک شاگرد مسٹر مشکاف کا ایک خط نقل کیا ہے جو ۲۹ اگست ۱۸۰۶ء کا لکھا ہوا ہے اس سے معلوم ہوگا کہ اردو ہندوستانی کی ہمہ گیری کا کیا حال ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :-

"ہندوستان کے ہر حصے میں جہاں جہاں میں ملازمت کے سلسلہ میں رہا یعنی کلکتہ سے لاہور کے قریب وجوار تک اور کوہستان کمایوں سے نربدا تک افغانوں، راجپوتوں، جاٹوں، سکھوں اور مختلف اقوام میں جو ان ممالک میں آباد ہیں جب میں نے سفر کیا ہے میں نے اس زبان کا عام رواج دیکھا ہے جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی۔ میں ذاتی تجربہ اور ان اطلاعات کی بنا پر جو مجھے دوسروں سے حاصل ہوئی ہیں۔ پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں راس کماری سے کشمیر تک اور آوا سے دریائے سندھ کے دہانے تک پیدل چلا جاؤں تو مجھے ہر جگہ ایسے لوگ ملیں گے جو ہندوستانی بول سکتے ہیں۔ اور میری رائے میں اسے وہ وسعت حاصل ہے جو دنیا کی کسی اور زبان کو نہیں ہے۔"

ان اقتباسات سے معلوم ہوا کہ اردو زبان اٹھارہویں صدی میں اپنی مقبولیت کے اعتبار سے تمام زبانوں پر سبقت لے گئی تھی۔ اور وہ ہندو اور مسلمانوں کی مشترک زبان تھی چنانچہ مرسیو دیو پان نے اپنی کتاب "اقوام

کی پیدائش" میں لکھا ہے کہ

" برطانوی ہند کی مردم شماری سرکاری کاغذات کے مطابق اس وقت ۲۸ کروڑ چالیس لاکھ ہے آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ ان میں تقریباً ۲۰ کروڑ نفوس کے درمیان جو چیز ایک مشترک رشتے کا کام دیتی ہے وہ اردو زبان ہے یہ زبان پورے یورپ کے برابر رقبہ میں بولی جاتی ہے۔"

(دیکھو خطبات گارسن ڈی تاسی ص۳۶۵)

یہی گارسن ڈی تاسی بمبئی گزٹ مورخہ ۲۷ فروری ۱۸۶۱ء کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

" بنگال بہار اور اڑیسہ کے زمیندار وں اور دوسرے باشندوں نے وائسرائے گورنر جنرل بہادر کو ایک عرضداشت بھیجی ہے جس میں یہ درخواست کی ہے کہ جدید ہائیکورٹ میں کارروائی اردو زبان میں ہونی چاہیئے۔ اس زمانہ میں بمبئی میں نئی نئی یونیورسٹی قائم ہوئی تھی ۱۸۶۶ء کے ڈگری کے امتحان میں اردو زبان بھی تھی اور اس کے نصاب میں باغ و بہار، اخلاق ہندی، مثنوی میرحسن اور دیوان ناسخ شریک تھے۔" (خطبات ص۲۲۳)

بنگال کے سلسلہ میں گارسن ڈی تاسی لکھتے ہیں:-

" اگرچہ صوبہ بنگال کی زبان بنگالی ہے۔ لیکن اردو جیسا کہ میں پیشتر بیان کر چکا ہوں وہ عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ راجہ کالی کرشن پرشاد نے حال میں ملکہ وکٹوریہ کی سالگرہ کے موقعہ پر سنسکرت میں جو نظم لکھی تھی اس کا ترجمہ اردو میں ہی شائع کیا ہے۔ جس کی ایک نقل انہوں نے مجھے بھی بھیجی ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ موصوف نے اس کا بنگالی ترجمہ شائع نہیں کیا۔"

اسی سلسلے میں ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں کہ :-

" باوجود ان مباحث کے جن کی نسبت ہم نے ابھی ذکر کیا ہے۔ اردو ہندوستان کی مشترک زبان کی حیثیت سے مسلم ہے ڈیوک آف اڈنبرا نے اسی زبان میں اپنے دوران سفر میں تقریریں کیں اور اسی زبان میں ڈیوک موصوف کی تعریف و توصیف میں قصیدے لکھے گئے۔ آجکل ساؤتھ کنزنگٹن میوزیم میں شہزادہ البرٹ کی جو نمائش ہو رہی ہے اس کے نیچے اردو زبان میں کتبہ لکھا گیا ہے " (خطبات گارسن ڈی تاسی)

(۴)

گارسن ڈی تاسی جنہوں نے ہندوستانی زبانوں میں بہت سے خطبے دیئے ہیں اور بہت سی مفید کتابیں لکھی ہیں ۱۸۶۵ء کے ایک خطبہ میں لکھتے ہیں

" لوگوں کا خیال ہندوستانی کی نسبت خواہ کچھ ہو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن گئی ہے۔ روز بروز جو اس کی ترقی ہو رہی ہے اس کی وجہ سے وہ پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی ہے اس مسئلہ کی نسبت کپتان مور نے جو مرکزی حکومت میں ترجمان کی خدمت پر مامور ہیں اپنی رائے سے مجھے ان الفاظ میں مطلع کیا ہے :-

" بلاشبہ کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانی مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کرے گی۔ اس زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلۂ خیالات کرتے ہیں ریل کی وجہ سے جو اندرون ملک میں ہزار ہا میل کی مسافت میں پھیل گئی ہے۔ ہندوستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو اور بھی ملنے جلنے کا موقعہ ملا ہے چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہندوستانی زبان اس مقصد کو بطریق

احسن پورا کرتی ہے۔ اسلئے کہ اس کی ساخت میں ہندی، فارسی، عربی کے عنصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجۂ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد پورا کرے" (خطبات ص ۵۸)

اس سلسلہ میں یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہ ۱۸۶۱ء میں مہاراجہ کشمیر کی گدی نشینی کے موقعہ پر جموں میں جو دربار ہوا اس میں مسٹر ڈیوس جو اس موقع پر حکومت ہند کے نمائندے تھے جب نئے راجہ کے سینہ پر تمغہ لگا چکے تو مہاراجہ نے ان کی تقریر کا جواب اردو میں دیا۔ جب سر جان وارنٹن وائسرائے کے عہدے پر فائز ہوئے تو انہوں نے آگرے میں ایک بڑا شاندار دربار منعقد کیا۔ جب وائسرائے تخت پر بیٹھے تو سر ولیم میور نے شاہی فرمان کا ترجمہ اردو میں پڑھا۔ اور خود وائسرائے نے حاضرین کے روبرو ہندوستانی میں تقریر کی۔ اسی طرح برٹش انڈیا ایسوسی ایشن مرادآباد میں گورنر نے اردو میں تقریر کی اور مدرسہ مرادآباد کے افتتاح کے موقع پر بھی موصوف نے اردو کے ذریعہ جلسہ کو مخاطب کیا۔ مہاراجہ بنارس نے ۱۸۶۸ء میں چیمبرز انسائیکلو پیڈیا کے اردو ترجمہ کے لئے دس ہزار روپے منظور کئے۔ غرضکہ ہندوستان کے مہاراجگان زمیندار جاگیردار سب ہی لوگ اردو کو اپنی زبان سمجھتے تھے اور اسی میں حکام اور گورنروں کی خدمت میں سپاسنامے پیش کرتے تھے جس کی تفصیل گارسن ڈی تاسی کے خطبات سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اب فیصلہ آپکے اختیار میں ہے۔

البتہ ایک سوال ایسا ہے جسے حل ہو جانا چاہیئے۔ یعنی اردو کی مخالفت کن اسباب کے تحت شروع کی گئی۔ اور یہ فتح کن لوگوں کو حاصل ہوا

بات یہ ہے کہ آج سے ایک سو سال پہلے زبان کے مسئلہ نے سیاسی رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ ہر شخص جانتا تھا کہ زبان کا تعلق علم سے ہے سیاست سے نہیں ہے۔ چنانچہ جرمنی کے بادشاہ ہمیشہ فرانسی زبان کو ترجیح دیتے رہے کیونکہ ان کے خیال میں فرانسیسی زبان ادائے مطالب کے لئے بہت موزون تھی۔ لیکن بعد میں زبان کے مسئلہ کو سیاسی رنگ دیا گیا۔ اور سیاسی رنگ نے آگے چل کر مذہبی رنگ اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ زبان کا مسئلہ قوموں کی جاگیر بنا لیا گیا۔ اور ہندوستان میں اسے ہندو اور مسلمان میں تقسیم کر دیا گیا۔

اس موضوع پر ہم آئندہ کسی فرصت میں بحث کریں گے ؛

حضرت کاظم بنارسی

دوش پہ بار ہو گئی اردو ؛ ایک آزار ہو گئی اردو
دشمنوں کی نگاہ میں کاظم ؛ آخرش خار ہو گئی اردو

تھا عرش پہ اک روز دماغ اردو ؛ پامالِ خزاں آج ہے باغ اردو
غفلت تو ذرا قوم کی دیکھو کاظم ؛ وہ سوتی ہے بجھتا ہے چراغ اردو

پیامِ ادب

(از سیکریٹری)

پیام ادب ایک ادبی ادارہ ہے اور اس کا پیغام بھی ادیبانہ ہے۔ مگر یہ جس ادب کا پیغام دینا چاہتا ہے۔ وہ ادب برائے ادب ہے اور نہ برائے آوارگی۔ بلکہ برائے ادب اور برائے زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے نصب العین میں صرف زبان نہیں، ادب نہیں بلکہ علم و عمل ہے۔ خلوص اور اخلاق سبھی چیزیں ہیں اور اگر یہ محاسن اس کے دامنِ عمل میں نہ ہوتے تو اس کا پیام نہ کوئی پیام تھا اور نہ ادب کوئی ادب۔ اسی جامعیت نے اس کو پیام ادب بننے پر مجبور کیا ہے۔

ہمیں خوشی و مسرت ہے کہ حضرت جگر مراد آبادی مدظلہ العالی نے پیام ادب کی سرپرستی قبول فرما لی ہے۔ اور ہمارے اس سال کے قابل قدر ادباء سیاسی و ادبی سوجھ بوجھ رکھنے والے معزز حضرات اس کے ساتھ ہیں جن کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔

۱۔ صدر جناب مولوی مہیش پرشاد صاحب۔
۲۔ سیکریٹری جناب محمد منظہر الحق صاحب۔
۳۔ سیکریٹری بیرونی امور۔ جناب محی الدین اشرف صاحب۔
۴۔ ” جناب عبدالرشید صاحب بی۔ اے۔
۵۔ جناب علامہ خیر بہوروی صاحب۔

۶ - جناب مولوی محمد عبدالعالی صاحب ۔
۷ - جناب ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب ۔
۸ - جناب مولوی غلام محمد قادر صاحب ۔
۹ - جناب مولوی محمد اطہر صاحب وکیل ۔
۱۰ - جناب عبدالقدوس صاحب ۔
۱۱ - جناب رام کمار چوبے صاحب ۔
۱۲ - جناب مرزا اصغر حسین صاحب ۔
۱۳ - جناب کبریا مختار صاحب ۔
۱۴ - جناب رگھوناتھ سنگھ صاحب ۔
۱۵ - نکہت آرا بیگم نکہت ۔
۱۶ - جناب سید اشتیاق حسین صاحب ۔
۱۷ - جناب سید علی کبیر رضوی صاحب ۔
۱۸ - جناب محمد یعقوب صاحب ۔
۱۹ - جناب روشن مہتا صاحب جنرل سکریٹری تھیا سوفیکل سوسائٹی ۔
۲۰ - جناب جگت نارائن صاحب ۔
۲۱ - جناب روی سرن شرما صاحب ۔
۲۲ - جناب بابو دیوی نرائن صاحب ایڈووکیٹ ۔
۲۳ - جناب ایچ۔ بی ملکانی صاحب۔ پرنسپل ڈی۔ جی کالج ۔

نصب العین :-

پیام ادب کا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟ بتلانے کی ضرورت

نہیں۔ کیونکہ یہ چیز اس کے نام سے صاف نمایاں ہے اغراض و مقاصد حاضر
ہے یہ اسقدر جامع اور مکمل ہے کہ اس سے کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا
جب یہ صحیح ہے تو آیئے اور ہماری ہمنوائی کیجئے۔ اپنے عمل سے اغراض و
مقاصد کی تائید فرمایئے۔ اور یہی تائید پیام ادب کا مقصد حیات ہے۔

اغراض و مقاصد:-

۱- ہر ممکن طریقہ سے انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے ہندوستانی زبان و ادب
کی خدمت کرنا۔

۲- مقامی شعراء اور نثر نگاروں کی ہمت افزائی کے لئے مشاعرے
اور تقریری مقابلے منعقد کرنا۔

۳- تعلیم کی ترویج و ترقی کے لئے بالغوں اور نابالغوں کو ہر ممکن
سہولت بہم پہونچانا۔ مدرسوں اور شبینہ مدرسوں کو فروغ دینا۔
اور موجودہ مدارس کی تعلیمی حالت درست کرنا۔

۴- اپنی آواز کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچانے کے لئے
ایک پریس خریدنا۔ کوئی معیاری اخبار یا رسالہ کا اجراء ہوسکے۔

۵- عوام کی ادبی۔ اخلاقی، معاشرتی اصلاح و ترقی کے لئے ایسی
تعلیم گاہوں کا اجراء جہاں خصوصاً مرتب و مسلسل لیکچروں کے
ذریعے تعلیم دی جائے۔

دفتر کا باب ہر انسان کے لئے کھلا ہے۔ جو ہر شعبۂ حیات میں
انسان ہو۔ انسان اور انسانیت کی سربلندی جس کا شخصی یا اجتماعی
نصب العین ہوا اور اغراض و مقاصد سے کلی اتفاق ہو۔

ہم ان تمام حضرات کا جنہوں نے اشتراک عمل اور تعاون سے پیام ادب کی مدد فرماتے رہے خلوص دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ ہم تمام حضرات کا فرداً فرداً شکریہ ادا کریں۔ اسلئے میں ایک بار پھر اپنے تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ بھی پیام ادب کے تعمیری کاموں میں ہر ممکن مدد فرمائینگے اور کوئی وقت بھی اس کی ترقی میں سدراہ نہ ہونے دینگے۔

آزاد ہندوستان کی بدلتی ہوئی فضا میں ایک قومی پریس کی کس قدر ضرورت ہے آپ سے پوشیدہ نہیں۔ پیام ادب عرصہ سے اس کے لئے کوشاں ہے امید ہے کہ نہ صرف بنارس کا ادب پرور بلکہ ہندوستان کا کل ادب نواز طبقہ اپنے تعاون سے جلد از جلد اس اسکیم کو کامیاب بنا دیگا۔

آخر میں ان تمام معزز حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو ہماری دعوت قبول فرما کر دفتر میں تشریف لائے اور اپنے مفید مشوروں سے سرفراز فرمایا۔ اور آخر میں آپ کی خدمت میں ان میں سے کچھ حضرات کے مشورے پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمایئے:-

---

اراکین انجمن پیام ادب کی دعوت پر مجھے انجمن کے دفتر میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ وقتی طور پر اور مختصر سے وقت میں جو کچھ تاثرات میں نے قبول کئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ انجمن کے اراکین میں کام کرنے کا ولولہ بڑی حد تک پایا جاتا ہے۔ بہت سی مفید تحریکات اس کے پیش نظر ہیں، مخلص و سرگرم جماعت کے سامنے دشواریاں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس بنا پر مجھے امید ہے کہ انجمن مذکور اپنے مقاصد میں

ضرور کامیاب ہوگی۔ وما توفیقی الا باللہ۔

۷ ربیع الآخر ۶۷ھ　　　جگر مراد آبادی

ادارہ پیام ادب اردو ادب کی جو خدمت انجام دے رہا ہے قابل ستائش ہے۔ لیکن میرے ناچیز خیال میں صرف اتنا عرض کردینا مناسب ہوگا۔ کہ ترقی پسند ادب کو اپنا مسلک بنائیں اور زمانہ کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ترقی پسند ادب مصیبتوں سے دوچار ہوتا جا رہا ہے آپ یاد رکھیں کہ ماضی اس کے نقش۔ حال اس کی چال اور مستقبل منزل ہے،

رائے بالا پرشاد گوڑ

مدن پورہ بنارس　　　جنرل مینجر ادبی روشنی۔ حیدرآباد دکن

آج میں نے انجمن پیام ادب کا معائنہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ کارکنان انجمن کام کرنے کا اشتیاق رکھتے ہیں۔ گو انہوں نے انجمن ابھی ایک سال پیشتر قائم کی۔ لیکن ان کی کوششوں نے کافی اثر پیدا کیا ہے۔ اردو زبان مشترکہ زبان ہے اور اس کی جتنی بھی خدمت کی جائے کم ہے اور جتنی بھی انجمنیں کام کریں وہ کم ہیں۔ یہاں مقامی ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں میں اچھے ادب کا احساس پیدا کرایا جائے۔ ہفتہ واری۔ ماہانہ اخبار نکالا جائے جلسوں جلسوں کے ذریعہ اس زبان کی کافی تشہیر و اشاعت ہو۔

میں انجمن پیام ادب کے کارکنوں کے انہماک سے متاثر ہوا اور مجھے قوی امید ہے کہ وہ اپنا کام جاری رکھیں گے۔ میری خواہش

ہے کہ وہ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوں۔

سری کرشن سنہا
ایچ۔ سی۔ ایس حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آج بتاریخ ۳۰ اگست کو انجمن پیام ادب مدنپورہ بنارس میں بسلسلہ کار سرکار حاضر ہوا۔ ناظم انجمن و دیگر اراکین سے تبادلہ خیالات ہوا۔ واقعی قوم کے نوجوانوں میں ایسے خیالات نیک پیدا ہونے ملک و قوم کے لئے شگون نیک ہے۔

ناظم انجمن خصوصاً ایک پرجوش اور جدت پسند طبیعت رکھتے ہیں اور قومی خدمت کے جو ارادے ان کے ہیں خدا ان کو پورا کرے تعلیم بالغان کا خیال ان کے دل میں خاص طور سے موجزن ہے اور اس کے حصول کے ذرائع بہت سے ان کے دماغ میں ہیں جن کے پورے ہونے کے لئے وقت اور سرمایہ کی ضرورت ہے جہاں تک میرے امکان میں ہے میں بھی انکی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں اور اپنے محکمہ کی توجہ بھی اس جانب مبذول کرانا میرا فرض ہے مگر دس کی لاٹھی ایک کا بوجھ ہوتا ہے قوم کے ہر فرد کو اس ادارے کی مدد کرنی ضروری ہے تاکہ یہ انجمن پھولے پھلے بڑھے اور کامیاب ہو۔ آمین

True copy.
A. Husain. Deputy Inspector
Mohammaden School Benares
Division Benares. 30-8-47.